زندہ دلانِ حیدرآباد کی ڈیڑھ سالی
شگوفہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کا طنزیہ و مزاحیہ ڈیڑھ ماہی

ایڈیٹر: سید مصطفیٰ کمال

قیمت: ڈیڑھ روپیہ

سالانہ بشمول خاص نمبر دس روپیہ

جلد ۱ • شمارہ ۴ • مارچ۔اپریل ۱۹۶۹ء

مجلس مشاورت

کرشن چندر • راجندر سنگھ بیدی • بھارت چند کھنہ • زینت ساجدہ

مجلس ادارت:

مجتبیٰ حسین • حمایت اللہ • احسن علی مرزا

جنرل منیجر: ممتاز احمد • منیجر اشتہارات: حمید صدیقی

سرکولیشن منیجر: مصطفیٰ علی بیگ

سرورق: سعادت علی خاں

کتابت: غوث محمد • محمد غالب • فخرالدین • عبدالباسط

۲۷ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد فون ۵۱۵۲۰

طابع، ناشر و ایڈیٹر: سید مصطفیٰ کمال

مطبوعہ: اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار • بائنڈر: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس چھتہ بازار

خوب سے خوب تر کی تلاش
آپ کو یقیناً
ہمہ اقسام کے جوتوں کی اس
چھوٹی سی دنیا میں لے آئے گی
شو ورلڈ
ہر موسم، ہر فیشن، ہر ڈزائین اور ہر سائز کے جوتے
عورتوں، بچوں اور مردوں کے لیے
شوز، سینڈل، چپل اور سلیم شاہی
شو ورلڈ
سالار جنگ بلڈنگ، پتھر گٹی، حیدر آباد، فون نمبر ۴۴۸۵۲

غالب کو تم بُرا کیوں کہو

دلاور فگار

کل ایک ناقدِ غالب نے مجھ سے یہ پوچھا
کہ قدرِ غالبِ مرحوم کا سبب کیا ہے

مجھے بتاؤ کہ دیوانِ حضرتِ غالب
کلام پاک ہے انجیل ہے کہ گیتا ہے

سُنا ہے شہر کراچی میں ایک صاحب ہیں
کلام ان کا بھی غالب سے ملتا جلتا ہے

اسی طرح سے ہر ایک شہر اور قصبہ میں
نہ جانے کتنے ہی غالب ہیں کس نے دیکھا ہے

ہمارا دوست طفیلی بھی ہے بڑا شاعر
اگرچہ ایک بڑے آدمی کا چمچہ ہے

تو پھر یہ غالبِ مرحوم کی ہی برسی کیوں
مجھے بتاؤ کہ ان میں خصوصیت کیا ہے

نہ ذوق کا ہے کہیں تذکرہ نہ مومن کا
نہ ذکرِ میر کہیں ہے نہ یومِ سودا ہے

یقین و ناہر و جوش و فراق کچھ بھی نہیں
مری نظر میں تو غالب سے ذوق اونچا ہے

مجھے تو میر تقی میر سے ہے ایک لگاؤ
کہ میر کچھ بھی سہی شاعری تو کرتا ہے

یہ رنگ لائی ہے غالب کی پارٹی بندی
کہ آج سارے جہاں میں اسی کا چرچا ہے

یہ روس والے جو غالب پہ جان دیتے ہیں
مرے خیال میں اس میں بھی کچھ گھپلا ہے

خبر ملی ہے سفیرانِ محترم سے مجھے
کہ اس میں کچھ کمیونسٹوں کا بھی اشارہ ہے

کہاں کے ایسے بڑے آرٹسٹ تھے غالب
یہ چند اہلِ ادب کا پروپیگنڈہ ہے

ہزار عیب ہیں اس کے کلام میں لیکن
وہ دیکھ سکتا ہے ان کو جو آنکھ والا ہے

انا نے مار دیا ورنہ شاعر اچھا تھا
نتیجہ یہ کہ جو ہونا تھا اس کا آدھا ہے

لکھی ہے ایک غزل کی ردیف ہوتے تک
کوئی بتائے کہ کیا یہ بھی ہو املا ہے!

کبھی ہے محو حسینوں سے دھول دھپا میں
کبھی کسی کا وہ سوتے میں بوسہ لیتا ہے

جو کہہ رہے ہیں کہ غالب ہے فلسفی شاعر
مجھے بتائیں کہ بوسہ میں فلسفہ کیا ہے

جہاں رستم کی توقع ہوی تفسیر کہا
تمہیں کہو کہ یہ معیارِ شاعری کیا ہے

شراب جام میں ہے اور جام ہاتھوں میں
مگر یہ رند بلا نوش پھر بھی پیاسا ہے

جو شاعری ہو تجمل حسین خاں کے لیے
وہ اک طرح کی خوشامد ہو شاعری کیا ہے

خطاب و خلعت و دربار کے لیے اس نے
نہ جانے کتنے امیروں پہ جال ڈالا ہے

سنا یہ ہے کہ وہ صوفی بھی تھا ولی بھی تھا
اب اس کے بعد تو پیغمبری کا درجہ ہے

کہا جو میں نے کہ پڑھیے تو پہلے غالب کو
تو بولے خاک پڑھوں مدعا تو عنقا ہے

مجھے خبر ہے کہ غالب کی زندگی کیا تھی — کہ میں نے حضرت غالب کا نظم دیکھا ہے
تمام عمر کسی ڈومنی سے عشق کیا — یہی تو حضرت غالب کا کارنامہ ہے
سزا ہوئی تھی تو کچھ جرم بھی کیا ہوگا — بغیر جرم کسی کو پولیس نے پکڑا ہے
سنی جو میں نے یہ تنقید تو سمجھ نہ سکا — کہ اس غریب کو غالب سے دشمنی کیا ہے
سمجھ گیا کہ یہ بکواس بے سبب تو نہیں — دماغ کا کوئی پرزہ ضرور ڈھیلا ہے
یہ مبتلا ہے مسلسل فرسٹریشن میں — اسی سبب سے تو غالب پہ طنز کرتا ہے
بڑھی جو بات تو پھر میں نے اس کو سمجھایا — ادب میں حضرت غالب کا مرتبہ کیا ہے
بتایا اس کو کہ وہ زندگی کا ہے شاعر — بہت قریب سے دنیا کو اس نے دیکھا ہے
عجب تضاد کی حامل ہے اس کی شخصیت — عجیب شخص ہے، برباد ہو کے ہنستا ہے
چراغ صبح کی مانند زندگی اس کی — اک آسرا ہے، اک ارماں ہے، اک تمنا ہے
جو اس کو روکنا چاہو تو اور تیز بہے — عجیب موج رواں ہے، عجیب دریا ہے
چھلک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن — رفو کی اس کو ضرورت ہے نہ پروا ہے
وہ لکھ رہا ہے حکایات خوں چکان جنوں — جبھی تو اس کے قلم سے لہو ٹپکتا ہے
بس ایک لفظ کے پردے میں داستاں کہنا — یہ فکر و فن کی بلندی اسی کا حصہ ہے
نہ کیوں ہوں آج وہ مشہور پوری دنیا میں — کہ اس کی فکر کا موضوع پوری دنیا ہے
پہنچ گیا ہے وہ اس منزل تفکر پر — جہاں دماغ بھی دل کی طرح دھڑکتا ہے
بقول شمسی مینائی اس کا ہر مصرع — رخ بشر کی طرح کیفیت بدلتا ہے
یہ ہم نے مانا کہ کچھ خامیاں بھی تھیں اس میں — وہ خامیاں نہیں رکھتا یہ کس کا دعویٰ ہے
ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ اس کی شخصیت — کہاں تک اس کے تفکر میں کارفرما ہے
وہ آدمی تھا، خطا آدمی کی ہے فطرت — یہ کیوں کہیں کہ وہ انساں نہیں فرشتہ ہے
جو چاہتے ہیں کہ فوق البشر بنا دیں اسے — ہمیں تو ایسے ان احباب سے بھی شکوہ ہے
ہزار لوگوں نے چاہا کہ اس کے ساتھ چلیں — مگر وہ پہلے بھی تنہا تھا اب بھی تنہا ہے
اسے مرے ہوئے سو سال ہو چکے ہیں مگر — مجھے وہ آج بھی زندہ دکھائی دیتا ہے
کبھی ولی، کبھی واعظ، کبھی خراباتی — سمجھ سکو تو سمجھ لو وہ اک معما ہے
اگر یہ سچ ہے کہ الفاظ روح رکھتے ہیں — تو یہ بھی سچ ہے، وہ الفاظ کا مسیحا ہے

غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلہ میں ایک تازہ تخلیق

کالجوں اور مدارس کی فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی لیباریٹریز کے لیے

ہر قسم کے سائنسی آلات اور کیمیکلس کے مسلمہ فراہم کنندگان

پریمئیر ٹریڈنگ کمپنی

جنرل کنٹراکٹر و گورنمنٹ سپلائرز

تلک روڈ، حیدرآباد ۱ (آندھرا پردیش)

فون 43602

گرام: لیباریٹری

ہری چند اختر

سوانح غالب

مزاح

"تنقید غالب" کا دور دورہ ہے، اور تحقیق و تدقیق کی سنگلاخ زمین میں نئے نئے پھول اور پودے اُگا کر ویرانے کو گلزار بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس ضمن میں مصنفوں اور شاعروں کے سوانح حیات اُن کے کلام اور تصانیف سے مرتب کرنے کا شغل عام ہو چکا ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ حنظل میں سے عطر نکالنے کی کوشش کے مترادف ہے۔ لیکن لکھنے والوں نے کتابیں لکھ ڈالیں؛ اور ہم ابھی اظہار رائے کے گنبد سے باہر نہیں آ سکے ؎

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرس کارواں رہے

پس خاک از تودہ گلاں بردار پرغل کرتے ہوئے مرزا غالب پر قلم صاف کرتا ہوں۔ انکے سوانح حیات بعض حضرات بڑی تحقیق و تفتیش کے بعد کتابی صورت میں پیش کر چکے ہیں، پھر بھی میرا خیال ہے کہ ان سطور میں جو کچھ مختصراً پیش کیا جا رہا ہے۔ اُسے پڑھنے کے بعد آپ مصنف کو دعائے مغفرت سے یاد فرمائیں گے۔

"غالب کے حالات"

نام: مرزا کا نام تمام تذکرہ نویسوں نے اسد اللہ خاں لکھا ہے چونکہ آپ ایرانی النسل تھے، اس لئے اسد اللہ اور خاں کے درمیان بیگ کا لفظ بھی بڑھا دیا جاتا ہے؛ لیکن نئے محققوں نے اس نام کے معاملے کو بھی خاص تحقیقات کا مستحق سمجھا، اور بڑی کاوش و تلاش کے بعد ثابت کر دکھایا ہے کہ غالب کا نام احمد شاہ ابدالی یا ماؤزے تنگ نہیں، بلکہ اسد اللہ خاں تھا۔ ان کے اس انکشاف کی تائید مرزا کے دو شعروں سے ہوتی ہے ؎

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

مرزا کا تخلص کئی غزلوں میں اسد ہے اور اکثر میں غالب۔ اس سے پڑھے لکھے لوگوں کو شک ہو چلا تھا کہ مرزا کا دیوان دو مختلف شاعروں کے کلام کا مجموعہ ہے۔ لیکن ہمارے نئے تذکرہ نویسوں نے بزور قلم ثابت کر دیا ہے کہ غالب اور اسد دراصل ایک شخص کے دو تخلص ہیں۔ البتہ ان تذکرہ نگاروں کا یہ خیال درست نہیں کہ مرزا پہلے اسد تھے۔ پھر غالب بن گئے۔

rekhta

حقیقت یہ ہے کہ مرزا نے آخر تک اسدؔ تخلص ترک نہیں کیا، بلکہ مرنے کے بعد بھی سب سے پہلا شعر اسی تخلص سے کہا، فرماتے ہیں ؎

یہ لاشِ بے کفن اسدِؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

پیدائش

نام اور تخلص کا مسئلہ یوں حل ہو گیا، لیکن مرزا کے سنِ پیدائش اور عمر کے بارے میں نئے اور پرانے تمام تذکرہ نویسوں نے بڑی طرح ٹھوکریں کھائی ہیں۔ سب نے غالبؔ کا سنِ پیدائش ۱۲۱۲ھ لکھا ہے، اور عمر ۷۳ سال لیکن یہ صریحاً غلط ہے، مرزا خود کہتے ہیں ؎

فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

اس سے ظاہر ہے کہ مرزا نہ صرف قیس عامری کے زمانے میں زندہ تھے بلکہ عمر میں بھی اس سے بڑے تھے۔ کیونکہ جن دنوں قیس ایک مبتدی چھوکرے کی حیثیت میں مکتب کی دیواروں پر لام الف لکھتا پھرتا تھا، اُس وقت مرزا صاحب بے خودی کے پروفیسر مقرر ہو چکے تھے۔

مجنوں کے زمانے میں مرزا کی موجودگی کا ان کے ایک اور شعر سے بھی ثبوت ملتا ہے ؎

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

ان دونوں شعروں کو ملا کر پڑھیں، تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مرزا غالبؔ قیس عامری سے بہت زیادہ خوبصورت تھے۔ پہلا شعر بتاتا ہے۔ کہ آپ مجنوں سے عمر میں بہت بڑے تھے لیکن دوسرا شعر کہہ رہا ہے کہ لیلیٰ جو مجنوں کی محبوبہ ہونے کے علاوہ خود بھی اُس پہ فریفتہ تھی۔ جب مرزا غالبؔ کے سامنے آتی تو نوجوان مجنوں کو بہت حقیر سمجھنے لگتی، اور اس حقارت کا کھلے لفظوں میں اظہار کر دیتی تھی۔ مرزا نے اگرچہ اسے اپنی معشوق فریبی کا کرشمہ ظاہر کرنا چاہا۔ لیکن یہ اُن کی کسرِ نفسی ہے، اگر مرزا، مجنوں کے مقابلے میں یوسف نہ ہوتے تو لیلیٰ پر اُن کی معشوق فریبی بھی کارگر نہ ہو سکتی۔

والدین

غالبؔ کے باپ کا نام تمام تذکروں میں عبداللہ بیگ درج ہے لیکن مرزا کے کلام سے اس پر کچھ بھی روشنی نہیں پڑتی۔ تاہم مرزا کے باپ کا کچھ نہ کچھ نام تھا ضرور۔ کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ اب سے کئی سو سال پہلے بھی ہندوستان میں باپوں کے نام ہوا کرتے تھے۔ مثلاً جہانگیر کے والد کا نام جلال الدین اکبر تھا ———

اور ہمایوں کے باپ کا ظہیر الدین بابر بادشاہ، اس تاریخی انکشاف کے بعد اگر قافیے کی رعایت سے اسداللہ کے باپ کا نام عبداللہ تسلیم کر لیا جائے تو میرے خیال میں کوئی قباحت نہیں۔

مرزا کی والدہ ماجدہ کا نام کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن انھوں نے اپنے ایک خط میں شکایت کی ہے کہ ایک شخص نے اُن کو بڑھاپے میں ماں کی گالی دی۔ اس سے ثابت ہوا کہ غالبؔ کی کم سے کم ایک ماں ضرور تھی۔

تعلیم

معلوم نہیں مرزا نے تعلیم کہاں پائی۔ مجنوں کے زمانے میں کوئی باقاعدہ اسکول اور کالج تو تھا نہیں، صرف ایک دبستان تھا جس کی دیواریں مجنوں نے لام الف لکھ لکھ کر سیاہ کر ڈالی تھیں۔ اس لئے کسی اور کے وہاں کچھ لکھنے کی گنجائش ہی نہ رہی۔ مجنوں سے پیشتر شاید، غالبؔ نے بھی یہاں کچھ دن گذارے ہوں لیکن ظنِ غالب یہی ہے کہ مرزا گھر پر ہی پڑھتے تھے بہرحال یہ ظاہر ہے کہ وہ جاہل نہیں تھے، اگر ناخواندہ ہوتے، تو شعر کیونکر لکھ سکتے، اور اتنی تصانیف کہاں سے آجاتیں؟ شمس العلماء مولوی محمد آزاد نے بھی صرف بہادر شاہ ظفر کے اشعار کو ذوقؔ کی تصنیف بتایا ہے غالبؔ کے بارے میں اس حسنِ ظن کا اظہار نہیں کیا۔

غالبؔ نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ پس دونوں زبانیں جانتے تھے البتہ اپنی ایک کتاب کا نام "عودِ ہندی" رکھنے سے ظاہر ہے کہ تحریر و تصنیف میں وہ اردو کو ہندی لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ مردم شماری کے وقت انھوں نے اپنی مادری زبان ہندی لکھوائی تھی۔

پیشہ اور شغل

مرزا کا سب سے بڑا اور مستقل پیشہ تو عاشقی تھا، جس کا ثبوت اُن کے دیوانوں میں جا بجا ملتا ہے۔ دوسرا شغل یہ تھا کہ شعر چن چن کر رسوا ہوتے رہتے تھے، خود مانتے ہیں کہ۔ ؏

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اس کے علاوہ بعض اور اشغال بھی تھے، مثلاً انھوں نے مصوّری بھی سیکھی تھی فرماتے ہیں ؎

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

کچھ مدت یہ شیوہ رہا کہ صبح سویرے ضروریات سے فارغ ہوتے ہی کان پر قلم رکھ کر نکل کھڑے ہوتے اور سارا سارا دن بلا معاوضہ لوگوں کے خطوط لکھتے پھرا کرتے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی سوشل سروس لیگ کے ممبر بن گئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ؎

مگر لکھوائے کوئی ان کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

"مختصر حالات"

اب مرزا کے مختصر سوانح حیات سنئے۔ بخوف طوالت صرف چند واقعات کے بیان پر اکتفا کروں گا۔ جو عام محققوں اور تذکرہ نویسوں کی نظروں سے اوجھل رہے۔

مرزا کی زندگی اگرچہ عسرت میں گزرتی تھی۔ لیکن اس کے لئے اللہ میاں ذمہ دار نہ تھے، خود مرزا کو اقرار ہے کہ خدا نے تو انھیں دونوں جہاں دے دیئے تھے۔ سنئے ؎

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ پھر دونوں جہان گئے کہاں؟ جواب مرزا کے اس شعر میں موجود ہے ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

پس دونوں جہاں بھی گھر کے ساتھ ہی لٹا دیئے ہوں گے۔

غالب کا گھر نہ صرف ویران تھا بلکہ اس میں ویرانی سی ویرانی تھی چناں چہ ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

لیکن یہ گھر وسیع نہ تھا اور مرزا کو ورزش کے لئے یا شاید گیند بلا کھیلنے کے لئے بہت کھلی جگہ کی ضرورت تھی اس لئے جنگل میں جا رہے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

کم نہیں وہ بھی خرابی میں یہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

عادات اور خصائل

مرزا بڑے سادہ لوح اور صاف دل انسان تھے، اکثر ایسی حرکتیں کر بیٹھتے جن کا نتیجہ ان کے حق میں بہت برا ہوتا۔ چناں چہ ایک دن محبوب کی گلی میں بیٹھے بیٹھے ذرا سی غلطی کے باعث پاسبان سے چندیا گنجی کرالی۔ کہتے ہیں ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

ایک مرتبہ خود محبوب کے ہاتھوں بھی پٹے۔ لیکن قصور اپنا تھا، اس لئے نہایت ایمانداری سے اعتراف بھی کر لیا کہ ؎

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اس سادہ لوحی کی بدولت ایک دن محبوب کی حد سے زیادہ تعریف کر کے ایک غم خوار رازداں کو رقیب بنالیا۔ ثبوت ملاحظہ ہو ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

لیکن دیوانہ بکار خویش ہوشیار، کبھی کبھی رقیب کو جل بھی دے جاتے ؎

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

مرزا نجوم اور جوتش کے نہ صرف قائل تھے۔ بلکہ محبت کے معاملوں میں بھی سب سے پوچھ گچھ کرتے رہتے تھے اسی لئے کہا ہے ؎

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

"غالب کا دل"

غالب کا دل عام لوگوں کی طرح خون کا قطرہ یا گوشت کا لوتھڑا نہ تھا بلکہ آفت کا ایک بڑا سا ٹکڑا تھا اور مرزا اس کی آوارگی کے ہمیشہ شاکی رہتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

لیکن خدا نے فضل کیا اور مرزا کو جلد ہی اس سے رہائی مل گئی ایک دن بیٹھے بیٹھے سوزِ نہاں کا دورہ ہوا اور سارے کا سارا دل بے محابا جل گیا۔ اس حادثہ فاجعہ کا ذکر مرزا نے یوں کیا ہے ؎

دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا
آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا

بد قسمتی سے مرزا کے ناخن بہت جلد جلد

بڑھتے تھے۔ چنانچہ زخم ابھی بھرنے بھی نہ پایا تھا کہ ناخنوں کے کھرنڈ پھر تیز ہو جاتے۔ فرماتے ہیں ؎

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بڑھنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

• غالب کا زمانہ •

غالب کے زمانے میں دلی میں غم الفت کا قحط پڑ گیا تھا۔ فرماتے ہیں ؎

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غم اُلفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہے کھائیں گے کیا؟

افسوس کہ سارے دیوان میں کہیں وضاحت نہیں کی گئی کہ غم الفت بادشاہ کے توشہ خانے میں موجود تھا یا وہاں بھی جھاڑو پھر گئی تھی۔ نیز یہ کہ راشن کی دکانوں پر کس بھاؤ بکتا تھا۔

البتہ یہ صاف ظاہر ہے کہ مرزا کی خوراک غم الفت تھی یا کم از کم غم الفت ان کی خوراک کا جزو اعظم تھا۔

لیکن اس قحط سالی میں بعض چیزوں کی ارزانی بھی تھی۔ مثلاً دل اور جان بازار میں بکا کرتے تھے اور ہر شخص جب اور جتنے چاہے خرید سکتا تھا۔ مرزا کو اعتراف ہے ؎

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

غالب کے زمانے میں پورے سات آسمان تھے۔ آج کل نو آسمان بتائے جاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ باقی دو آسمان ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی عہد میں ولایت سے بن کر آئے۔ مرزا کے زمانے کے ساتوں آسمان ایک لحظہ بھی سکون و قیام کی لذت سے آشنا نہ ہوتے، بلکہ رات دن لگاتار گھومتے رہتے تھے۔ مرزا لکھتے ہیں ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اس زمانے کی ایک عجیب و غریب خصوصیت یہ تھی کہ اگر کسی محبوب کا منہ معلوم نہ ہو سکے تو اس کی ہیچمدانی کھل جاتی تھی۔ ایک مرتبہ مرزا پر بھی یہ گزر گئی۔ اعتراف فرماتے ہیں ؎

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچمدانی میری

سب سے بڑی قباحت اس عہد کی یہ تھی کہ مجرموں کو سخت وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں۔ چنانچہ مرزا غالب ایسے شخص کو بھی ایک مرتبہ کسی جرم کی پاداش میں پنجرے میں بند کر دیا گیا لیکن زمانہ اس قدر خراب تھا کہ مرزا اس صورت حال کو بھی غنیمت سمجھتے تھے ؎

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

غالب کا محبوب

مرزا کا محبوب بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا اس کا نام سارے جہاں کو معلوم تھا لیکن کبھی، کسی شہر اور کسی تھانے میں کوئی شخص اس کا نام ستم گر کہے بغیر نہ لیتا تھا۔ مرزا کہتے ہیں ؎

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستم گر کہے بغیر

اس محبوب کے عادات و خصائل بھی عجیب تھے۔ مثلاً گالیاں بہت دیتا تھا۔ مرزا پوچھتے ہیں ؎

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

اسی طرح اگر مرزا کبھی شکوہ شکایت کریں تو وہ فوراً اٹھ بھاگتا اور بلیماران سے باڑہ ہندو راؤ تک مرزا کے جتنے رقیب تھے سب کو جمع کر لیتا۔ مرزا جھنجھلا کے کہتے ہیں ؎

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشہ ہوا گلہ نہ ہوا

جب کبھی وہ رقیب کی بغل میں سوتا تو مرزا کے خواب میں آ کر پنہاں تبسم کیا کرتا۔ اسی لیے کہا ہے ؎

بغل میں غیر کی آپ آج سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا

یہ معشوق تخت، کرسی، مونڈھے یا چارپائی پر بیٹھنا پسند نہ کرتا تھا۔ ہمیشہ بوریے پر بیٹھتا اور اگر بوریا نہ ملے تو کھڑے کھڑے چل دیتا، مرزا رو رہے ہیں کہ ؎

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

یوں بھی وہ اچھا خاصا احمق تھا۔ عشق و محبت کے سیدھے معاملات بھی نہ سمجھ سکتا تھا مرزا شاکی ہیں کہ ؎

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

آخر میں وہ بے طلب بوسے بھی دینے لگا تھا۔ مرزا کی بدگمانی بھری شہادت حاضر ہے ؎

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

معشوق کی صحت اچھی نہ تھی۔ اکثر رشتہ وغیرہ کا شاکی رہتا تھا ایک دن بڑی منتوں کے بعد مرزا کے قتل پر راضی ہوا۔ نوک شمشیر سے دو چار کچوکے

دینے کے بعد کاری زخم لگانے کے لئے ہاتھ اُٹھایا تھا کہ فالج گرا اور بھلا چنگا ہاتھ تسمہ پا کی ٹانگ بن کے لٹکنے لگا۔ مرزا کی رنج و غم کے مارے چیخ نکل گئی ؎

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے

اس کے مذہب کے متعلق صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ غیر مسلم تھا جبھی تو کہا تھا ؎

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ
غلطی کی جو کافر کو مسلمان سمجھا

بین الاقوامی شہرت کے باوجود بے چارے کا گھر گھاٹ کہیں نہ تھا ایک خیمے میں زندگی کے دن کاٹ رہا تھا۔ مرزا فرماتے ہیں ؎

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی!

لیکن بعض اشعار میں سنگ و در، پاسباں، دیوار وغیرہ کی موجودگی کا قرینہ پایا جاتا ہے۔ ممکن ہے بعد میں اُسے کوئی مکان الاٹ کر دیا گیا ہو۔

چند متفرق واقعات

ایک مرتبہ مرزا نے اُڑنے کی کوشش کی لیکن ہوائی جہاز وغیرہ سے کام نہیں لیا۔ کسی اور طریق سے اُڑے جس کا نسخہ اور ترکیب استعمال وغیرہ سینہ بسینہ اُن تک پہنچ کر اُن کے ساتھ ہی دفن ہو گئے۔ بہر حال اُڑے تو سہی لیکن پھٹ جال میں پھنس کے پھڑپھڑانے لگے۔ اسی حال میں لکھتے ہیں ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اس شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے کچھ مدت گھونسلے میں گزاری۔ مرزا کا ایک دربان بھی تھا جب مرزا کا گھر ویران ہو گیا۔ تو اس کے لئے کوئی کام نہ رہا مگر اس مرزا کا ساتھ نہ چھوڑا اور گھاس کھود کر گزر اوقات کرتا رہا۔ مرزا فرماتے ہیں ؎

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

غالب نے کئی مرتبہ بہشت کی سیر بھی کی۔ ایک مرتبہ وہاں سے واپس آئے تو محبوب سے کہنے لگے ؎

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

خواجہ خضر سے بھی مرزا کی اکثر ملاقاتیں ہوئیں نصرت الملک کے قصیدے میں ارشاد ہوتا ہے ؎

تو سکندر ہے، مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات کا ہے

لیکن دوسرے مصرع میں شرف کا لفظ دوستانہ مروت کے مارے استعمال کیا ہے۔ ورنہ دراصل وہ خضر کو رہنمائی کے قابل نہ سمجھتے تھے۔ ثبوت حاضر ہے ؎

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

مرزا بزدل بھی تھے۔ ایک مرتبہ سڑک پہ راہزن کا سامنا ہو گیا تو اسے دیکھتے ہی دم دبا کر بھاگ نکلے۔ لیکن دوڑ دھوپ کے باوجود پکڑے گئے اب ستم ظریف لٹھو مار نے ڈانٹ کر کہا۔ "کمبخت ہمیں اس قدر دوڑایا ہے، لے اب ذرا پاؤں داب" اس واقعہ کو یوں نظم کیا ہے ؎

بھاگے تھے ہم بہت سو اُسی کی سزا ملی
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

مرزا اپنے رقیب کے دروازے پہ ایک کم نہ ایک زیادہ پورے ہزار مرتبہ گئے۔ شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ محبوب بھی اتنی ہی مرتبہ وہاں گیا ؎

جانا پڑا رقیب کے در پہ ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگزر کو میں

کچھ مدت مرزا کی عسرت نے یہ شدت اختیار کر رکھی کہ بے چارے دلی کی گلیوں میں بالکل ننگ دھڑنگ پھرتے رہے ایک دن اسی حالت میں بادشاہ کے دربار میں پہونچے اور بہادر شاہ ظفر سے شکوہ کیا ؎

آپ کا بندہ اور پھرے ننگا
آپ کا نوکر اور کھائے اُدھار

اس پر بادشاہ نے آپ کو ایک بہت بڑا کرتا سلوا دیا۔ جس کا دامن اتنا بڑا تھا کہ اس کا ایک سرا دھونے میں ہی پورا دریا خشک ہو گیا۔ اس پہ ارشاد ہوا ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

نوٹ: اس زمانے میں دریائے جمنا کا نام معاصی تھا۔ اور مرزا وہیں کپڑے دھونے جایا کرتے تھے۔

دریائے گنگا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سورگ لوک میں بہتا تھا اور سری رام چندر جی کے ایک بزرگ مہاراجہ بھاگیرتھ تپیا کے زور سے اسے زمین پر لائے تھے۔ اب دریائے جمنا کے ظہور کا حال مرزا جی سے سن لیجئے۔ کہتے ہیں کہ میری وحشت کے لئے عرصۂ آفاق

بھی تنگ ہو گیا تو زمین کو بڑی شرم آئی یعنی کہ اس کی پیشانی پر بڑے زور کا پسینہ آگیا بس وہی دریا بن گیا ؎

دشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ ہے
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

مرزا کا محبوب کہیں کعبہ کے گرد و نواح میں سکونت پذیر تھا۔ چنانچہ جب کبھی مرزا کو دربار پر ڈانٹ ڈپٹ ہوتی تو وہ کعبے کی جانب چل دینے کہتا ہے ؎

اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

اس طرح آئے دن محبوب کے گھر اور کعبۃ اللہ جانے آنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس اس زمانے میں کعبہ دہلی سے بہت قریب تھا۔ بعد میں گرمی کی شدت سے زمین پھیل گئی تو دہلی اور مکے کا درمیانی فاصلہ بھی بڑھ گیا یا پھر مرزا کو کوئی بہت تیز رفتار سواری مل گئی ہو گی۔

مرزا نے مرنے کے بعد بہت سے شعر کہے اور کسی نہ کسی طرح اپنے شاگردوں کو بھی پہنچائے۔ انھوں نے دیوان میں شامل کر دیئے۔ مثلاً

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد

یہ ساری غزل مرنے کے بعد لکھی گئی۔ اسی قبیل کے دو شعر اور حاضر ہیں ؎

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

مجنوں عمر میں تو مرزا سے چھوٹا تھا ہی اس کا انتقال بھی اُن سے پہلے ہوا۔ مرزا کہتے ہیں ؎

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

مرزا بے چارے کی موت بھی غریب الوطنی میں ہوئی۔ فرماتے ہیں ؎

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

موت یوں ہوئی کہ آخر عمر میں وحشت کے دورے پڑنے لگے تھے ایک دن اسی حالت میں سر پھوڑ کر مر گئے۔ مرتے مرتے ارشاد ہوا ؎

مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

معشوق کو یہ حال معلوم ہوا تو مروت نے جوش مارا، اور دوڑا آیا لیکن مرزا غریب میں ایک نظر دیکھ لینے کی بھی سکت نہ رہی تھی۔ چنانچہ یہ شعر پڑھتے پڑھتے جان بحق ہو گئے ؎

منہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے!
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ○

■■

مخدوم کا تنقیدی جائزہ

مخدوم ایک مطالعہ

مصنف داؤد اشرف

ملنے کا پتہ : بتوسط شگوفہ

اُردو کا پہلا طنز نگار

غالبؔ ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر غالبؔ نہ ہوتا تو بعض لوگوں کا یہ کہنا صحیح سمجھا جاتا کہ اُردو شاعری طنز کے نشتروں سے خالی ہے۔ غالبؔ کی طنز و ظرافت کی بنیاد نظر و جزاور بصیرت و سبر پر ہے۔ غالبؔ کے یہاں سلیقہ بڑی چیز ہے۔ اور یہی ان کے فن کی جان ہے۔ اگر ہم ان ہی کے الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ "بہ بعید رنگِ گلستاں" ہے غالب کا عقیدہ طنز کے بارے میں یہ ہے کہ وہ جتنا خمدار ہو اچھا ہے۔ غالبؔ کا طنز شوخ و شنگ ہوتے ہوئے بھی دھیما ہے۔ اس میں چابک دستِ نشتر زن کے ہاتھ کی صفائی اور گداز ہے ۔۔۔۔۔۔

(ڈاکٹر شوکت سبزواری)

عبدالحلیم نعیمی

... سے اندازِ بیاں اور

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

عام طور پر جب بھی کسی خاص و مشہور شخص پر مضمون لکھا جاتا ہے۔ ابتدا اقبال کے اس شعر سے کی جاتی ہے۔ مجبوراً یہاں پر بھی ابتدا اسی شعر سے کی جا رہی ہے کہ کسی کی دلشکنی نہ ہو اور سند رہے بوقت ضرورت کام آوے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ اقبال کے اس شعر کا تعلق مرزا غالب کی پیدائش ہی سے ہے۔

راویان روایات و حاکیان حاکیات شاہد لربائے سخن اور لبِ شیریں ادائے افسانہ ہائے کہن کو یوں ہفت آرائش سے مزین کرتے ہیں کہ اگلے وقتوں میں کسی جگہ نرگس کا یہ ننھا سا پودا گیتی پذیر تھا۔ اس میں پھول کھلتے مگر افسوس صد افسوس ان پھولوں کو کوئی دیکھنے والا نہ تھا کیونکہ یہ پودا آبادی سے دور ایک ویرانے میں تھا، اگر اتفاقاً کوئی راہگیر ادھر سے گذرتا تو دیکھتا کہ نرگس پر پانی کے چند قطرات مثل آنسو لرز رہے ہیں۔ اس کو گمان گذرتا کہ نرگس رو رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ نرگس اسی طرح ہزاروں سال تک روتی رہی (خیال رہے اس نرگس کا فلم ایکٹرس نرگس سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی طرح کی بھی مناسبت محض اتفاقیہ ہے جس کے لئے راوی پر ذمہ داری عائد نہیں ہوتی) دفعتہً قدرت کو یہ خیال آیا کہ نرگس اسی طرح روتی رہی تو عنقریب نابینا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ پس اس خیال کا آنا تھا اس نے گل کھلایا اور ہندوستان کے ایک شہر آگرہ میں ایک شخص نام جس کا اسد اللہ خاں اور تخلص غالب تھا پیدا کیا۔ غالب آگرہ میں پیدا ہو کر "دہلوی" کیونکر مشہور ہوئے یہ ایک راز ہے۔ بہرکیف بچپن میں غالب کو آیا اسی نرگس کے پاس بٹھا دیتی اور وہ گھنٹوں نرگس کو گھورتے رہتے ہیں کہاں نرگس ایک نظر کے لئے رو رہی تھی کہاں اسے گھورنے والا شخص مل گیا۔ جس نرگس نے رونا دھونا بند کیا اور مسکرانا شروع کر دیا۔ اسی واقعہ کو علامہ اقبال نے شعر کا جامہ پہنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ویسے اغیار نے یہ افواہ بھی اڑائی

کہ نرگس کبھی نہ روئی تھی۔ غالب تو یوں ہی پیدا ہو گئے تھے۔ جس کو آنسو سمجھا گیا وہ شبنم کے قطرات تھے جو نرگس پر لرز رہے تھے۔ اور غالب کیونکہ موسم گرما میں پیدا ہوئے تھے اس لئے شبنم گرنا بند ہو گئی۔ خیر جتنے منہ اتنی باتیں۔

غالب جوں جوں بڑے ہوتے گئے شاعر ہوتے گئے اور جوان ہو کر مکمل شاعر ہو گئے لوگوں نے بہت کوشش کی کہ غالب شاعر نہ بننے پائیں۔ لیکن قسمت پر کس کا اختیار؟ قدرت جو بات ٹھان لیتی ہے وہ ہو کر ہی رہتی ہے۔ غرض غالب نے شعر کہنا شروع کر دیئے۔ پہلے اسدؔ تخلص رکھا جب شاعری مغلوب ہو گئی تو غالبؔ تخلص رکھ لیا۔ مشہور و مقبول شاعر تھے کس کی مجال جو لوٹ کتا جو جی میں آتا تخلص رکھتے۔ شراب سے بھی شغل شروع کر دیا۔ کبھی شراب کے خم لنڈھا کر شعر کہتے تو کبھی شعر کہہ کر خم لنڈھاتے۔ کبھی اردو میں شعر کہتے تو کبھی فارسی میں کہتے۔ جب اشعار سے دل بھر جاتا تو خطوط لکھنے بیٹھ جاتے۔ خطوط سے اکتا جاتے تو پھر شعر کہنے لگتے اور جب دونوں سے جی بھر گیا تو انتقال فرما گئے۔

جب مرزا کا انتقال ہوا تو حسب عادت نرگس نے منہ لبسورنا شروع کر دیا ابھی وہ رونے کی تیاری ہی کر رہی تھی کہ تابڑ توڑ ایسے ایسے شعراء پیدا ہوئے کہ نرگس گھبرا گئی اور چشم حیرت بنی انہیں تکنے لگی۔ اور پھر اس نے رونے سے ہمیشہ کیلئے توبہ کر لی۔ وہ اکثر دل میں سوچتی۔ کیا زمانہ تھا وہ بھی ہزاروں سال رونے کے بعد مشکل سے بلکہ بڑی مشکل سے ایک۔ ایک غالب پیدا ہوئے تھے اور اب حال ہے کہ روئے بغیر ہی ہزاروں شاعر پیدا ہو رہے ہیں۔ اب روئے میری بلا۔

دوسری بات جو کسی شاعر پر مضمون لکھتے وقت مضمون نگار لکھتا ہے وہ یہ کہ "حضرت فلاں نہ صرف اچھے شاعر تھے بلکہ اچھے انسان بھی تھے"، یہ پڑھ کر قاری کے دل میں یہ خیال مائل پرواز ہوتا ہے کہ یہ خصوصیت صرف حضرت فلاں میں ہی تھی کہ وہ شاعر ہونے کے باوجود انسان بھی تھے تو پھر باقی شعراء.... ؟ اس طرح کے مضامین پڑھ کر یہ خیال جڑ پکڑ لیتا ہے کہ شاعر اور انسان دو متضاد چیزیں ہیں۔ ہمیں یہ تو نہیں معلوم کہ شاعر اور انسان میں کیا فرق ہے؟ لیکن یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ غالبؔ شاعر بھی تھے اور انسان بھی تھے۔

ہم بذات خود غالبؔ سے کبھی نہیں ملے اس کی وجہ یہ ہے کہ غالبؔ ہم سے پہلے پیدا ہو کر انتقال فرما گئے یا پھر ہم ہی ان کے بعد پیدا ہوئے۔ اس باب میں غالب کو کسی طرح بھی قصور وار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ غلطی یقیناً ہماری ہے ہم غالب سے ملے نہیں اس لئے ان کے بارے میں کچھ لکھنا یقیناً دروغ گوئی سے تعبیر کیا جائے گا اور یہ بات ایک مضمون نگار کے لئے شرم و ندامت کے بحر زخار میں غوطہ زنی کے مترادف ہو گی۔ اس لئے اس باب میں ہم کچھ تحریر کرنے سے معذور ہیں۔ ہم نے غالبؔ کے اشعار پڑھے ہیں بلکہ ڈنکے کی چوٹ پڑھے ہیں اور ان اشعار کے ذریعہ ہی غالب کو سمجھنے کی سعی کی ہے۔ غالب کے اشعار سمجھنا کچھ اتنا آسان بھی نہیں جتنا کہ لوگ سمجھ بیٹھے ہیں۔ چند اشعار تو بالکل فہم سے بالاتر ہیں یعنی ان کا مطلب بغیر دماغ میں گھسے اوپر سے گزر جاتا ہے اور قاری ایسے اشعار کا الٹا سیدھا مطلب نکال کر اشعار کی توہین کرتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایسے اشعار کو پوری دماغی طاقت کو بروئے کار لا کر سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ جیسے ایک شعر ہے ؏

ہے خبر گرم ان کے آنے کی ⁂ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

بعض شارحین لکھتے ہیں کہ شاعر کی بیوی اپنے مائکہ گئی ہوئی ہے۔ شاعر کو اس کے آنے کی خبر ملتی ہے، تو وہ گھبرا جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ بیوی کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی آئیں گے۔ وہ جانتا ہے اس کی سسرال کے لوگ کافی خوش خوراک ہیں۔ ان کی خوش خوراکی سے متاثر ہو کر "بوری" کی جگہ بڑی بوری یعنی "بوریا" کا لفظ استعمال کرتے ہوئے کہتا ہے۔ وہ لوگ آنے والے ہیں افسوس آج ہی گھر میں اناج کا بوریا نہ ہوا۔ اس شعر کی شرح لکھتے وقت اگر پہلے مصرعہ پر غور کیا جائے تو مطلب خود بخود ذہن میں آجاتا ہے لیکن شارحین نے اس پر غور نہیں کیا۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے آنے کی خبر بہت گرم ہے "محبوب" اس لئے کہ کبھی بیوی کے لئے شعر کہکر وقت ضائع نہیں کرتا ہے۔ محبوب تو ہاتھ آتا نہیں اس لئے شاعر اس کے آنے کی خبر کو ہی پکڑنا چاہتا ہے مگر گرم خبر کو پکڑا کس طرح جائے۔ وہ کپڑے کی تلاش کرتا ہے کپڑا نہیں ملتا ہے تو بوریا ڈھونڈتا ہے۔ لیکن وہ سب تو پہلے شراب کی نذر ہو چکا ہے۔ ویسے پکڑتا ہے تو ہاتھ جل جانے کا اندیشہ دامن گیر ہے بس حسرت سے کہہ کر رہ جاتا ہے کہ محبوب کے آنے کی خبر کو کس طرح پکڑ لوں۔ میرے پاس بوریا بھی نہیں ہے۔

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی ہے
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

شاعر کو اپنے محبوب سے وحشت کی حد تک عشق تھا وہ محبوب سے اظہار عشق کرتا ہے تو محبوب گھبرا کر کہتا "یا وحشت" شاعر وہاں سے چلا آتا۔ کپڑے تار تار کئے جنگل بیابان، چٹیل میدان یعنی سارے ہندوستان میں محبوب کا دم بھرتا پھرتا۔ ریلوں پر محبوب کا نام لئے شہروں، شہروں، گلیوں گلیوں گھوما کرتا۔ شاعر کی اس وحشت کی وجہ سے محبوب کا نام لوگوں کی زبان پر گھومنے لگا۔ دفعتہً محبوب کے دماغ میں ایک کوندہ سا لپکا۔ اس نے سوچا کیوں نہ اس مفت کی شہرت سے فائدہ اٹھایا جائے یہ سوچ کر وہ الیکشن میں کھڑا ہو گیا۔ مشہور پہلے ہی ہو چکا تھا۔ دوسروں کی ضمانت ضبط کر کے کامیاب ہوا۔ شاعر نے اس کا نام اخبار میں پڑھا۔ زیر لب مسکرایا۔ اور کہا "عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی ؛ میری وحشت تیری شہرت ہی سہی"۔

دیکھئے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

شاعر کے محبوب نے شاعر کو پوسٹ کارڈ بھیجا۔ پوسٹ کارڈ کافی پرانا یعنی ۳ پیسہ والا تھا۔ وہ بیرنگ ہو گیا۔ ڈاکیہ پوسٹ کارڈ لایا اور شاعر کے حوالے کیا۔ شاعر نے سوچا کہ ڈاکیہ چلا جائے تو اطمینان و سکون سے نامہ پڑھوں مگر ڈاکیہ وہیں کھڑا سوچ رہا تھا کہ پوسٹ کارڈ بیرنگ ہے اب میں ان سے دو چار پیسے کیا مانگوں یہ خود ہی دیکھ لیں اور دیدیں۔ شاعر مشہور آدمی ہے ڈاکیہ پیسے مانگتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ لیکن معاملہ سرکاری تھا پیسے چھوڑے بھی نہیں جا سکتے تھے۔ اسی شش و پنج کے عالم میں شاعر نے اس کی حالت کو بھانپ کر کہا۔ "دیکھئے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر ؛ کچھ تو پیغام زبانی اور ہے۔" یہ سنکر ڈاکیہ کی ہمت بڑھی اس نے دھیرے سے کہا "جی پیغام یہ ہے کہ خط بیرنگ ہے۔ پیسے دیدیجئے"۔

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

افسوس غالب آزاد شاعری سے ناواقف تھے ورنہ اس شعر کو یوں نہ کہتے۔ اس شعر کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ بس

اگر پریشانی ہے تو یہ کہ اس میں بہت پرانی تکنک استعمال کی گئی ہے۔ اس کو اگر یوں کہا جاتا تو بہت مناسب تھا۔

تھا درد سینہ میں میرے
بخشا ہوا اک شوخ کا
درد تھا اک یاد
گویا میرے محبوب کی
کی دوا اغیار نے کہ درد ہوجائے یہ دور
لیکن دوا سے

نہ ہوا
کچھ فائدہ
درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

درد یہ
اور ٹیس یہ
گر ختم ہو جاتی تو پھر
رہتا بھلا کیا میرے پاس
اس لئے ہوں سوچتا
درد نہ اچھا ہوا
تو برا پھر کیا ہوا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

یہ شعر غالب کے انتقال کے بعد کا ہے۔ جب غالب کا انتقال ہوا تو انہیں دہلی میں دفن کر دیا گیا۔ ان کی قبر کچی ہونے کی وجہ سے منہدم ہونے کے قریب تھی۔ وہ آسمان سے اپنی قبر کو دیکھتے اور کڑھتے۔ حکومت انگریز کی تھی اس لئے خاموش تھے۔ ملک آزاد ہوا۔ حالات سدھرے مگر غالب کی قبر جوں کی توں رہی۔ غالب سے محبت کرنے والوں نے اردو کی خوب خدمت کی۔ غالب کو خوب سراہا۔ ہزاروں کی تعداد میں دیوانِ غالب شائع کر کے فروخت کئے۔ غالب کے نام پر خوب جیبیں بھریں۔ لیکن غالب کی قبر کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوا۔ غالب دیکھتے رہے، آخر جب برداشت نہ کر سکے تو بہت حسرت سے بولے۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

داهی

تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

خلوصِ دل سے گاتے ہیں ہمارے شہر کے مچھر
بڑے داتا ہیں اپنے بلدیہ کے اسپیشل افسر

انھیں کا فیض ہے جو گندگی پھیلی ہے سڑکوں پر
انھیں کے فیض سے مسکن ہے اپنا، شہر کا ہر گھر

انھیں کی مہربانی ہے جو آزادی ملی ہم کو
ہماری قوم کے حق میں ہیں وہ انگریز سے بڑھ کر

جلوس اپنا جہاں چاہیں جدھر چاہیں نکالیں ہم
نہیں ہے ہم کو "پبلک سیفٹی آرڈرز" کا مطلق ڈر

ہماری پرورش کے واسطے گلیوں میں کوچوں میں
کہیں کوڑے کی ڈھیری ہے کہیں بھینسوں کا ہے گوبر

سٹی سے لے کے اسٹیشن تلک اپنا بول بالا ہے
یہ سبزی باغ کے نالے ہیں اپنے کلچرل سنٹر

ہمارے مورچوں پہ کوئی دشمن چڑھ نہیں سکتا
فلٹ کا توپ خانہ ہو کہ ڈی ڈی ٹی کا ہو بمبر
FLIT
BOMBER D.D.T

محلوں کا ہر اک نالا بنا ہے ویسٹ نام اپنا
شکستِ فاش کھاتا ہے "صفائی" کا جہاں لشکر

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
سڑک ہے آئینہ اور گندگی اس کے لیے جوہر

غلاظت میں بھی پوشیدہ ہے اک صورت بھلائی کی
مزدوری کھاد ہے کشتِ تمدن کے لیے گوہر

بڑھی رونق دواخانوں مطب اور اسپتالوں کی
غلاظت کا اثر پڑنے لگا جب عام صحت پر

تجارت شہر میں ایسے طبیبوں کی بھی چل نکلی
جو پہلے مارتے تھے دن کو مکھی رات کو مچھر

ہر اک موسم میں مچھر دانیاں بکنے لگیں اتنی
کہ پھیری کرنے والے بن گئے کپڑوں کے سوداگر

خدا کی یاد سے غافل نہیں ہوتے کبھی زاہد
ہمارے نیشتر کا قرض ہے شب زندہ داروں پر

ہمیں ہیں شامِ ہجراں میں انیسِ دردِ تنہائی
ہمیں عاشق کے ارمانوں کو بہلاتے ہیں گا گا کر

ہماری موسیقی کی جب صدا کانوں میں جاتی ہو
تو کس شفقت سے کہتے ہیں ہمارے اسپیشل افسر

مبارک ہو حصولِ رزق کی آزادیٔ کامل
"تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر"

سکالی والا جشنِ غالب میں

ام کیسا مصیبت میں گرفتار ہوا ہے
ہر وکت رہا کرتا ہے جھگڑا مرے آگے
سسرے کا گلا کرتا ہے کیوں ساس ماری
"مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے"

یہ کاں سے اُبل جاتا ہے شادی میں کوٹے
شاپنگ کو چلا آتا ہے منڈا مرے آگے
سب ام کو سمجھ لیتا ہے قربانی کا بکرا
سالی مرے پیچھے ہے تو سالا مرے آگے

اب زور دکھاتی نہیں دنیا مرے آگے
ہر وکت رہا کرتا ہے ڈنڈا مرے آگے
باوا ہے مسلمان تو انگریز خسر ہے
"کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے"

مکار ہے غدار ہے بیمان ہے دنیا
ہر روز دیا جاتا ہے دھوکا مرے آگے
چلغوزے بھی اخروٹ بھی کھاتا ہے املے
گالب کو کہا کرتا ہے اچھا مرے آگے

چھو فٹ کا ادمی ہے ہمیں ناپ کے دیکھو
گالب تو نظر آتا ہے بچہ مرے آگے
گر میں اندھیرا ہے تو تربت پہ اُجالا
زندوں سے بھی بڑھ جاتا ہے مُردا مرے آگے

مچھلی کا یہ اولاد ہے یا سانپ کا بچہ
بندے کو نگل جاتا ہے بندہ مرے آگے
کاموش تماشائی ہے کچھ کہہ نہیں سکتا
"ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے"

سلیمان خطیب

گر ـ گھر

برق آشیانوی

تشریح کلام غالب

اجمل ہمارے بھانجے ہیں۔ عرصہ ہوا کہ وہ ایک روز ہمارے پاس آئے اور مرزا غالب کی ایک غزل کا مطلب سمجھانے کے لئے کہا کیونکہ دوسرے دن ان کے مضمون اُردو کا امتحان تھا جس میں غالب کے کلام کی شرح ایک متوقع سوال تھا۔ غالب کی شرح آسان کام نہیں ہے ہم اپنے آپ کو اس کا اہل نہ پاتے تھے۔ ہم نے ان کو یہی بات سمجھائی لیکن وہ سر ہو گئے کہ ہم ہی ان کو غالب کے اشعار کا مطلب سمجھائیں۔ ہم نے پیچھا چھڑانے کی غرض سے ایسی بے معنی اور اوٹ پٹانگ بکواس شروع کر دی تاکہ وہ تنگ آ کر بھاگ جائیں اور ہماری جان چھوٹے لیکن نہ معلوم ان کو اس بکواس میں کیا لطف آیا کہ وہ دن ہے اور آج کا دن کہ وہ اکثر ہماری فرصت کے اوقات کے دشمن ہو گئے اور مرزا غالب کے کسی نہ کسی شعر کا مطلب سمجھانے کی خواہش کرتے ہیں۔ ہم پیچھا چھڑانے کے لئے جس قدر بے معنی بکواس کرتے ہیں اسی قدر وہ ہمارے سر ہونے لگتے ہیں۔ قارئین سے التجا ہے کہ وہ ہمارے حق میں عافیت کی دعا فرمائیں اور یہ بھی دعا کریں کہ اجمل ہمارا پیچھا چھوڑ دیں فقط

برق آشیانوی

آج اجمل کے ہاتھ میں دیوان غالب نظر نہ آیا تو ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ اجمل ہم پر بڑے مہربان ہیں اور بڑبڑانے سے نجات ملی۔ کسی مفید اور ضروری کام میں آج کی تعطیل گذرے گی۔ لیکن آتے ہی انہوں نے بڑے اچھے ترنم میں ذیل کا شعر پڑھا اور کہا کہ سمجھائیے مطلب ــــ تو آج بھی گھنٹہ آدھا گھنٹہ بکواس کرنی ہوگی ــ

اللہ رے شوق دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

چنانچہ ہم نے بھی شروع کر دی اپنی پرانی بکواس ــــ

"مرزا غالب نے لاکھ چاہا کہ محبوب کو بھول جائیں اور اپنی بیگم کی ہدایت پر عمل کر کے اللہ اللہ کرنے لگیں۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہو جائیں اور عاشقی و اشقی کا دھندا چھوڑ کر صراط مستقیم پر گامزن ہو جائیں لیکن جتنا وہ بھولنا چاہتے تھے اتنی ہی شدت سے ان کا محبوب دل و دماغ پر چھا رہا تھا۔ بلکہ پوری طاقت سے محبوب کی لگی اور اس کی یاد اپنی طرف کھینچ رہی تھی اس کشمکش سے تنگ آ کر انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب دل کا ہی کہا مان لیں اور اپنے آپ کو عاشق کے حوالہ کر دیں۔ بلکہ جب حوالہ کر دینا ہی ٹھہرا تو اس میں وہ کمال اور مقام حاصل کریں جو فنِ شاعری میں پایا تھا۔ اس فیصلہ پر عملی قدم اٹھانے کی کوشش کی تو قدم اٹھتا ہی نہ تھا۔ یعنے یہ کہ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ حصولِ مقصد کے لئے کیا کیا جائے۔ سوچتے سوچتے ایک بات سمجھ میں آئی وہ یہ کہ عشق کے میدان کا راز کے سورماؤں کے حالات کا غائر مطالعہ کر کے ان کے قدم بہ قدم چلیں تو شاید منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے سلطان العاشقین حضرت فرہاد المتخلص بہ کوہکن کا خیال آیا لیکن ساتھ ہی دل کانپ اٹھا کہ پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر لانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور انجام کار تیشہ سنبھال لینا پڑے گا پھر اس خیال سے دل کو ایک گونہ تسلی ہوئی کہ اگر انہوں نے تیشہ سنبھالا تھا تو ہم نے بھی "شیشہ" سنبھال رکھا ہے۔ اس کے بعد یاد آیا کہ ایک پیشوائے عشاق حضرت قیس عامری بھی گذرے ہیں جن کا تخلص لوگوں نے مجنوں رکھا ہے۔ اور جن پر مرزا صاحب نے لڑکپن میں ایک پتھر بھی اٹھایا تھا۔ لیکن جب اپنا سر یاد آیا تو اُن پر پھینکا نہ تھا بلکہ آہستہ سے اپنے جیب میں رکھ لیا تھا پھر نظر بچا کر ایک گلی میں لے جا کر پھینک دیا تھا۔ اور جب بڑے ہو کر شاعر ہوئے تو یہ شعر بھی فرمایا تھا ؎

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

حضرتِ مجنوں صحرائے عرب میں لیلیٰ کو یاد کرتے پھرتے تھے ان کے وردِ زبان یہ شعر تھا۔

لیلیٰ لیلیٰ پکاروں میں بن میں
لیلیٰ پیاری بسی میرے من میں

مگر ساتھ ہی اس خیال سے زبردست کوفت ہوئی کہ کیا لغو شعر فرمایا ہے حضرت مجنوں صحرائی نے۔۔۔۔ پھر یاد آیا کہ حضرت ممدوح کوئی بڑے شاعر نہیں تھے لہٰذا اُن کو معاف فرما دیا اور پھر اپنی دھن میں لگ گئے۔ ذہن پر کافی زور دینے پر بھی یاد نہ آیا کہ دلی یا اسکے مضافات میں کوئی ریگستان بھی ہے غور کرنے پر قریب قریب یقین ہو گیا کہ کوئی ریگ زار تو نواحی علاقہ میں نہیں ہے ایک عالیشان صحرا موسوم بہ صحرائے اعظم آفریقہ میں واقع ہے جو بہت دور ہے۔ راجپوتانے کے صحرا وسعت کے لحاظ سے بہت تنگ معلوم ہوئے۔ البتہ ملکِ "عرب" میں ایک صحرا کچھ وسیع و عریض تھا جو مقصد کے لئے بہتر و معقول تھا لیکن سوال یہ درپیش تھا کہ ؎

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تمکو مگر نہیں آتی

آخر مجبوری کے پیشِ نظر یہ طے کیا کہ ریگ زار نہ سہی۔ انسان کو بزرگوں کی تقلید میں اپنے گرد و پیش کے معاشی،

اقتصادی، سماجی، جغرافیائی تاریخی حالات اور عصری تقاضے بھی پیش نظر رکھنے پڑتے ہیں۔ لہٰذا طے پایا کہ بجائے ریگ زار کے کسی گھنے جنگل میں نکل جائیں ـــــ مگر جنگل میں جاکر کیا کرنا ہوگا ـــــ ؟ اس سے مرزا صاحب واقف نہ تھے پھر وہی مسئلہ درپیش تھا کہ کچھ نہ کچھ حالات ضرور معلوم کرنے چاہئیں۔ اتنے میں یاد آیا کہ شہر میں "لیلیٰ مجنوں" کی تازہ فلم آئی ہے۔ کیوں نہ وہ دیکھ لیں۔ چنانچہ اسی روز میٹنی شو دیکھنے چلے ـــــ وہاں پہنچے تو اتنا رش تھا کہ بکنگ بند ہو چکی تھی۔ اور ٹکٹ نہیں ملا ـــــ لیکن "بلیک" میں سینما ہال کے پیچھے کی طرف دو روپیہ کا ٹکٹ چار روپے میں فروخت ہو رہا تھا۔ ناچار وہی خرید کر داخل ہوئے تو بیٹھنے کے لیے جگہ نہ تھی۔ مجبوراً ایک طرف کھڑے ہو کر دیکھنا پڑا ـــــ پکچر شروع ہونے کے بعد ان کو سخت حیرانی اس بات کی ہوئی کہ لیلیٰ نے "ٹیڈی گرل" کی طرح چست اور اشتعال انگیز لباس کیوں پہن رکھا ہے اور کانوں میں یہ جدید ترین وضع کے آویزے کہاں سے آ گئے ـــــ پھر یہ محلات شاہی اور سمنٹ اور تارکول کی سڑکیں ـــــ ! .... گویا یہ تو ہمارے اشعار کی وہ شرح ہوئی جو برق آشیانوی کرتے ہیں جن میں اکثر ایسی چیزیں بھی لکھ مارتے ہیں "کہ جو ہم نے دیکھیں نہ سنیں اور جو ہم سے ایک صدی بعد میں وجود میں آئیں گی ـــــ" غرض پکچر دیکھ کر بہت مایوس ہوئے کیونکہ جس مقصد کے لیے گئے تھے وہ پورا نہ ہوا ـــــ اب ارادہ کر لیا کہ پہلے کسی جنگل کو چلے چلیں۔ باقی پروگرام وہیں بیٹھ کر اطمینان سے بنائیں۔ چنانچہ جس حال میں تھے اسی حال میں گھر سے نکلے اور دوڑنا شروع کیا ـــــ راستے میں پہلے مولوی اکرام اللہ صاحب ملے۔ انہوں نے پہلے سلام کیا جواب دینا تو درکنار مرزا غالب نے اُن کی طرف دیکھا تک نہیں ـــــ پھر نواب حسین مرزا ملے ـــــ پھر یکے بعد دیگرے سید سردار مرزا، میر مہدی مجروح، مولانا فضل حق، مولانا آزردہ، حکیم محمود خاں، مرزا غلام علی وحشت نے مرزا صاحب کو بے تحاشہ دوڑتے ہوئے دیکھا تو وہ حیران و پریشان ہو گئے۔ دو ایک نے پیچھا کرنا چاہا لیکن اس خیال سے رہ گئے کہ کہیں مرزا صاحب ناراض نہ ہو جائیں کہ اُن کے نجی معاملات میں دخل اندازی ہو گئی ـــــ چنانچہ مرزا صاحب کی نزاکت طبع کے پیش نظر کسی کو جرات نہ ہوئی۔

شام کے چار بجے مرزا صاحب گھر سے نکلے تھے اور رات دیر گئے تک نہیں لوٹے تو بیگم نے خیال کیا کہ کہیں "محفل مشاعرہ یا بزم مشاعرہ" ہو گی لیکن جب صبح بھی مرزا صاحب گھر نہیں آئے تو بیگم پریشان ہوئیں کہ ؎

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
آخر اس شخص کو ہوا کیا ہے"

دن چڑھے پر مرزا صاحب کے خاص خاص دوستوں کے گھر دریافت کروایا کہ کسی کے گھر "دشنہ" بنے تو نہیں پڑے ہیں۔ چند ایک کے پاس سے جواب آیا کہ گذشتہ شام کو انہوں نے مرزا صاحب کو ٹھنڈی سڑک اور خاص بازار میں سے دوڑ کر جاتے ہوئے دیکھا لیکن کسی کو یہ علم نہ تھا کہ وہ گئے کہاں ہیں۔ شام تک پورے شہر میں کھلبلی مچ گئی کہ مرزا غالب "گم" ہیں۔ لیکن حضرت ذوق نے فرمایا کہ گم نہیں ہیں۔ بلکہ اپنی بے معنی شاعری سے شرمندہ ہو کر روپوش ہو گئے ہیں دو دن، تین دن، چار دن بھی گذر گئے لیکن نہ ہی مرزا صاحب گھر آئے اور نہ ہی ان کا پتہ چلا۔ آخر بیگم نے اخبار

میں حسب ذیل اشتہار دیا:

میرے سرتاج حضرت اسد اللہ خاں اسد جو بعد میں غالب ہوئے اور "نوشہ" تو برسوں سے ہیں تقریباً چار روز سے گم ہیں۔ جو صاحب مرزا صاحب کو تلاش کر کے انہیں گھر لاکر پہنچا دیں گے یا کم از کم ان کا اتا پتہ معلوم کر کے بتلا دیں گے ان کو مرزا صاحب کی پانچ تازہ و غیر مطبوعہ غزلیں مفت، فوراً بلکہ دست بدست اور مبلغ دس روپے نقد مرزا صاحب کی چھ ماہ کی پنشن (جو عنقریب خزانہ شاہی سے ملنے والی ہے) ملنے پر ادا کر دیئے جائینگے مرزا صاحب کا حلیہ حسب ذیل ہے۔

ساٹھ سال عمر ہے لیکن طبیعت میں شگفتگی ہو تو چالیس سے بھی کم نظر آتے ہیں اگر انہیں چند روز سے نہ ملی ہو تو اسی (۸۰) برس سے اوپر معلوم ہوتے ہیں۔ جسم پر ڈھیلا سا کرتہ ہے اور سفید پاجامہ ہے۔ منہ پر داڑھی اور سر پر لانبی ٹوپی ہے۔ قد و قامت کا یہ عالم ہے کہ ہزاروں کے مجمع میں کھڑے ہوں تو صاف نظر آتے ہیں۔ رنگ کسی زمانے میں چمپئی تھا لیکن اب چہرہ دیکھ کر سینہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ ان کے ایک ہاتھ میں شیشہ ہوگا اور دوسرے ہاتھ میں پیمانہ۔

المعلنہ

اہلیہ اسد اللہ خاں غالب دہلوی

اس اعلان کے بعد چند من چلے لوگوں نے انعام کی خاطر بھولے بھٹکے مسافر کو جس کے ہاتھ میں شیشہ و پیمانہ نظر آیا پکڑ لیا اور جب تصدیق ہوئی کہ وہ مرزا غالب نہیں ہیں چھوڑ دیا۔ اکثر دوست احباب نے تو واقعی پریشان ہو کر بذات خود تلاش شروع کر دی یا اپنے ملازمین وغیرہ کو روانہ کر دیا۔ لیکن افسوس کہ مرزا صاحب کا پتہ چلنا تھا نہ چلا۔ ادھر بیگم رو رو کر دعائیں مانگتی تھیں کہ یا اللہ تو میرے نوشہ کو میرے گھر لادے۔

پندرہ روز گذرنے کے بعد آدھی رات کو اچانک دروازہ پر کچھ عجیب آوازیں آنے لگیں۔ بیگم ڈرتی ڈرتی دروازہ کے پاس پہنچیں اور پوچھا ——"کون ہے"——

جواب میں ایک بالکل نحیف سی آواز آئی —— بیگم —— دروازہ کھولو۔" بیگم آواز پہچان گئیں اور فوراً دروازہ کھولا۔ دیکھا تو دہلیز پر مرزا صاحب اوندھے منہ پڑے ہیں۔ بڑی مشکل سے مرزا صاحب کو اٹھا کر لائیں۔ مرزا صاحب کی حالت بالکل تباہ تھی۔ کپڑے خاردار جھاڑیوں میں الجھ کر لپیٹ گئے بلکہ تار تار ہو گئے تھے یا یوں کہا جا سکتا ہے۔

دیوانگی سے دوش پر زنار بھی نہیں

مرزا کے جسم پر تو کوئی تار بھی نہیں

جسم پر کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں زخم نہ آیا ہو—— نہ ہاتھ میں شیشہ تھا نہ پیمانہ۔ ہاتھ لہولہان، پاؤں میں چھالے صورت

ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پیٹ جاکر پیٹھ سے لگ گیا تھا۔ آنکھوں میں سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ دو چار منٹ کی مسلسل کوشش سے ایک آدھ لفظ زبان سے نکلتا تھا جو آسانی سے سمجھ میں کبھی نہ آتا تھا۔

آدھی رات کا وقت سارے شہر میں سناٹا۔ بیچاری بیگم کرتیں تو کیا کرتیں۔ روتی اور دعا کرتی بیٹھی رہیں۔ پچھلے پہر مرزا صاحب کی حالت غیر ہوگئی اور صبح ہوتے ہوتے بالکل بے حس و حرکت پڑ گئے۔ پھر قلب کی حرکت اور نبض کی رفتار بند ہوگئی۔ لیکن دونوں پاؤں اس طرح حرکت کر رہے تھے جیسے وہ دوڑنے کی کوشش کر رہے ہوں لیکن کمزوری و ضعف کے باعث مجبور ہوں۔ ابھی سورج کی آنکھیں کھلی بھی نہ تھیں کہ مرزا صاحب کی آنکھیں بالکل بند ہوگئیں اور پورا جسم بشمول پاؤں ساکت و صامت اور ٹھنڈا ہوگیا ـــــ صبح سویرے شہر میں یہ خبر عام ہوگئی کہ مرزا غالب چل بسے۔ اب لوگوں نے دوسری کارروائیاں شروع کر دیں۔ کئی انجمنوں نے دو تین گھنٹے کے اندر سیکڑوں روپیہ چندہ جمع کر لیا۔ تاکہ بڑی دھوم دھام سے دوسرے دن ان کے تعزیتی جلسے منائیں۔ حالانکہ وہاں مرزا صاحب کی میت اٹھانے کے لالے پڑے تھے۔ اس کی کسی کو فکر نہ تھی۔ ایک اسوسی ایشن نے ان کی یادگار میں ایک تھیٹر حال قائم کرنے کا منصوبہ بنا لیا جس کے لئے پانچ لاکھ کے صرفہ سے ایک عمارت تعمیر کرنے کی غرض سے رقم اکٹھا کرنی شروع کر دی۔ ایک ایک ادارہ نے ان کی مزار مبارک کی تعمیر کا پروگرام بنایا۔ ایک تنظیم نے وسط شہر میں ان کا مجسمہ نصب کرنے کی اسکیم مرتب کر لی۔ ایک جماعت نے ان کے نام سے ایک انجمن موسوم بہ "بزم غالب" قائم کرنے کا اعلان کر دیا۔

غرض سارے شہر میں مرزا صاحب کے نام پر مختلف شاندار منصوبے بنائے اور چلائے جانے لگے اور لاکھوں کی رقم جمع ہونا شروع ہوگئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سرمایہ کے تمام دروازے مرزا غالب کی آنکھوں کے منتظر تھے کہ جیسے ہی وہ بند ہوں یہ کھلیں مرزا صاحب کے نام پر تو یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ لیکن ان کی میت اور پسماندگان کو جو صیغہ واحد مونث تک محدود تھے کوئی نہ پوچھتا تھا۔ ان کی زندگی میں تو یہ تمام ادارے اور تنظیمیں مرزا غالب کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔ چہ جائیکہ ان کی کسی قسم کی مالی امداد کرتے۔

شام میں مرزا کی نماز جنازہ ہوئی۔ اور دفن کے لئے لوگ میت اٹھا کر قبرستان کی طرف لے چلے۔ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ تابوت لوگوں کے کاندھوں پر از خود حرکت کرتا ہوا محسوس ہوا۔ پہلے تو تابوت اٹھا کر چلنے والوں نے آپس میں ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ پھر جب سب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کر کے یقین کر لیا کہ تابوت یا اس کے مظروف میں کچھ حرکت ہو رہی ہے تو تابوت کو زمین پر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی سارے مجمع کی ایک مشترکہ چیخ نکل گئی۔ کفن کا زیریں حصہ حرکت کر رہا تھا اور حرکت میں دم بدم تیزی ہو رہی تھی۔ شرکائے میت کی ایک بھاری تعداد جو ایسی چیزوں سے ڈرتی تھی رفو چکر ہوگئی اور باقی لوگ کچھ نہ کچھ بہانہ کر کے بھاگنے لگے۔ چند لوگ ہمت کر کے میت کے اطراف جمع ہوگئے۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ خیال ظاہر کرتا تھا اور کوئی خیال ایسا نہ تھا کہ بیان کیا جاسکے۔ غرض جب لوگ کچھ خوف اور کچھ حیرت کے لہجے میں باتیں کر رہے تھے کہ اچانک چرچر کی سی ایک آواز آئی۔ مرزا صاحب نے کفن پھاڑ دیا اور اٹھ کر بیٹھ گئے اور یہ شعر فرمایا ؎

اللہ رے شوق دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

اور پاؤں تو اب بھی ہل رہے تھے۔ پھر مرزا صاحب نے تابوت میں بیٹھے ہوئے کفن سے نکل کر بیٹھے ہوئے حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"معزز حضرات ـــــ کئی دن تک میں حضرت مجنوں کی طرح بیابان خارزار میں مارا مارا پھرتا رہا اس میں میں نے وہ خلوص نیت اور صداقت عشق و محبت سے کام لیا تھا کہ اگرچہ بھوک پیاس زخموں، آبلوں اور کمزوری و ناتوانی سے میری موت واقع ہوگئی تھی لیکن وہ شوق دشت نوردی نہ مٹ سکا جو عشق و محبت کا خاصہ ہے۔ اسی شوق کے زیر اثر میرے پاؤں بھی کفن کے اندر ہلتے گئے اور اس خلوص و صداقت کے ساتھ کہ جسم میں روح رفتہ رفتہ واپس آنے لگی۔ جس کے نتیجہ میں آپ صاحبان دیکھ رہے ہیں کہ میں بالکل زندہ اور صحیح و سلامت ہوں۔ یہ کرشمہ عشق کا ہے جس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو سچے عاشق ہیں جن کا عشق سچا اور خالص یعنی (PURE) ہوتا ہے جیسے خالص مسکہ کا گھی۔ اگر اس میں ذرا بھی ڈالڈا کی ملاوٹ ہوئی تو سمجھو کہ گھوٹالہ ہوگیا۔ مردہ کا زندہ ہونا تو درکنار زندہ کا ہی مردہ نہ نکل جائے تو غنیمت جانو۔"

اس کے بعد مرزا صاحب تابوت سے اتر آئے اور جلوس میت کی قیادت کرتے ہوئے گھر کی جانب روانہ ہوئے تو راستے میں دیکھا کہ جابجا ان کی تعزیت کے جلسے ہو رہے تھے۔ ایک جلسہ میں ایک مقرر کہہ رہا تھا۔!

"افسوس! ہمارا ملک مردہ پرست ہے۔ مرزا غالب کی زندگی میں کسی نے ان کی قدر نہ کی۔ چونکہ قدر کا اندازہ قیمت سے ہوتا ہے لہٰذا یوں کہنا چاہئے کہ ان کی قیمت ادا نہ کی۔ خیر ــ وہ وقت تو گذر گیا۔ اب ان کی مختلف یادگاریں قائم کرنے کے لئے اس خاکسار کو بھاری رقمی امداد کی ضرورت ہے تاکہ مرزا صاحب کا نام اونچا کر سکے۔"

چونکہ مرزا صاحب اور ان کے ساتھی آگے بڑھ چکے تھے اس لئے بعد کی تقریر سنائی نہ دی البتہ رات تک شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ مرزا صاحب زندہ ہوگئے۔ پھر مرزا صاحب کو نہ کسی اور شخص کو معلوم ہوا کہ مرزا صاحب کے نام پر جمع کی ہوئی رقموں کا کیا ہوا ـــ کیونکہ پھر کسی گوشہ سے کوئی ایسی آواز ہی نہ آئی جس میں مرزا صاحب کا نام سنائی دیتا ـــ پھر وہی مرزا غالب تھے اور پھر وہی ـــ قید حیات و بند غم . . . ."

●●●

اتنے بے درد بھی بن جاؤ کہ غرض کچھ میرے بھلے سے نہ ہو
ہے یہ آپس کی بات سوچو تو جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
ایک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

وقار خلیل

اور ہر موڑ پہ، ہر شہر میں، ملکوں ملکوں
حضرتِ میرزا غالب کا ہوا شورِ نشور
ہائے یہ نذرِ عقیدت بہ مزارِ اردو
"سینکڑوں لاکھوں قدم"
سینکڑوں لاکھوں بدن
جشنِ غالب ہے کہ یہ ماتمِ یک حرفِ غزل
سرنگوں تاج محل
مہر بہ لب لال قلعہ
ارضِ دلّی کا نہ پوچھو احوال
سوگ میں لکھنؤ، کشمیر، دکن
سو برس اہلِ بصیرت کے لیے، سوچ میں ڈوبا ہوا لمحہ ہیں
وہ زباں جس پہ تھا غالب کو بھی ناز
ہائے اب اس کا علاقہ نہ چلن
اس کی کیا فکر کہ ہم ——
سادگی ہائے تمنا کہ بہ ہنگامِ نشاط
آج ہاتھوں میں چراغِ رُخِ انوار لیے
کوئے جاناں میں فقیہانِ حرم آتے ہیں
روشنئ لب و رخسار کو چمکاتے ہیں
مرقدِ حضرتِ غالب پہ غزل گاتے ہیں
پے تزئینِ وفا پھول چڑھا جاتے ہیں
ہائے کس دھوم سے غالب کا جنازہ اٹھا

ماتمِ یک حرفِ غزل

(غالب صدی تقاریب: ایک طنز ایک حقیقت)

غزل

راہی

کالج میں ہوا یہ بھی تماشہ مرے آگے
لڑکی کو جھڑکتا رہا لڑکا مرے آگے

بیوی سے لڑائی کے سبب گھر میں ہمیشہ
منظر ہے وہی "لوک سبھا" کا مرے آگے

چلمن سے جھلکتا ہے تبسم ترا لیکن
منہ کھولے پڑا ہے ترا کتا مرے آگے

بستر سے منسٹر جو ہوا میں، تو یہ دیکھا
ہر شخص ہوا جاتا ہے چمچا مرے آگے

اک "پی اے" ہے اور ایک ہے سکریٹری بیٹی
بھانجا مرے پیچھے ہے، بھتیجا مرے آگے

دو بیویاں ہیں، سالے ہیں، بہنوئی ہیں گھر میں
دن رات ہے "یو این او" کا جھگڑا مرے آگے

پکچر میں تو بیگم مرے پہلو میں ہیں لیکن
سالی مرے پیچھے ہے تو سالا مرے آگے

میں جبکہ "ایم ایل اے" ہوں تو راس آئیگا کس کو
امپورٹ اور اکسپورٹ کا دھندا مرے آگے

اب "میٹنی" کا وقت ہوا جاتا ہے، لیکن
رکھا ہے ریاضی کا یہ پرچا مرے آگے

اسٹیٹ میں اک "سینا" بنا رکھی ہے جب سے
چلتا نہیں سی "ایم" کا بھی بھیجا مرے آگے

بجلی سی گری مجھ پہ نقاب اٹھتے ہی راہی
یعنی کسی بڑھیا کا تھا چہرہ مرے آگے

غالب کی روح سے معذرت کے ساتھ

پیٹ منت کشِ غذا نہ ہوا
"یہ بھی اچھا ہوا برا نہ ہوا"

کیوں بلاتی ہو اپنے ڈیڈی کو
میرا آنا ہوا بلا نہ ہوا

ہے خبر گرم گیہوں آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ راشن کی حکمرانی تھی
گیہوں کھا کر مرا بھلا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں کمینوں کو
کیا شریفوں سے فائدا نہ ہوا

کیا کسی خان کی حکومت تھی
قرض لے کر مرا بھلا نہ ہوا

دھونس دیتے ہو، کوتوالی کی
دل ہوا میرا چوتھا نہ ہوا

سینکڑوں جمع ہیں پولس والے
کوئی بلوا ہوا، گلا نہ ہوا

شیخ صاحب سے اپنی بیوی کا
"حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"

لادے جلتے ہو لادیاں غم کی
کوئی عاشق ہوا گدھا نہ ہوا

کتنے شو ہوتے ہیں، خدا معلوم
گھر ہوا، اُن کا سینما نہ ہوا

بچ گئی جان، خیریت گذری
اُن کے ڈیڈی کا سامنا نہ ہوا

کیسے تم نے کھلائے آج کباب
ذائقہ منہ کا چٹ پٹا نہ ہوا

"شفیع عقیل"

غالبؔ کے مصرعے

جس طرح اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالبؔ شاعر تھے اسی طرح اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالبؔ نے مصرعے پہلے کہے اور اشعار بعد میں۔ ہر شاعر ۔۔۔۔۔ ("آزاد شاعروں" کو چھوڑ کر) پہلے مصرعہ کہتا ہے اور بعد میں شعر۔ وہ مصرعہ، اولیٰ ہو یا مصرعِ ثانی۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ پہلے مصرعہ میں شاعر اپنا پورا مطلب بیان کر چکا ہے لیکن چونکہ شعر کے لئے دو مصرعوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ایک مصرعہ بطور "پخ" لگا دیتا ہے تاکہ مصرعہ شعر بن جائے۔ بیشتر یوں بھی ہوتا ہے کہ شاعر مصرعۂ ثانی پہلے کہہ لیتا ہے اور جب وہ شعر مکمل کرنے کے لئے دو مصرعے اکٹھا کرتا ہے تو چول چوکس نہیں بیٹھتی اور معانی میں کچھ "گڑبڑ جھالا" پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کسی شاعر کے صحیح خیالات اور مطالب جاننے کے لئے ضروری ہے کہ اشعار کے بجائے اس کے مصرعوں کی تشریح کی جائے۔ غالب کے چند مصرعوں کی تشریح "یارانِ نکتہ داں" کے لئے "صلائے عام" کی حیثیت رکھتی ہے:۔

"کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک"

حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ نے اس مصرعہ میں کوزے میں دریا بند کر دیا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ غالبؔ کے محبوب نے اُسترے سے اپنا سر منڈوا رکھا ہے۔ غالبؔ اس سے وصل کے لئے کہتے ہیں۔ محبوب پہلے تو حیلے بہانے کرتا ہے اور پھر کہتا ہے چلو ہمیں منظور مگر مطالبہ جب مانا جائے گا جب اِس "چٹیل میدان" پہ بال اُگ آئیں گے اور سر پر زلفیں ہو جائیں گی۔ اب ظاہر ہے بال اُگنے کے لئے اور پھر زلفیں بننے کے لئے کم از کم دو تین برس درکار ہیں۔ اس لئے غالبؔ کہتے ہیں۔ جب تیرے زلفیں آئیں گی اس وقت تک کون جئے گا؟

"آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں"

غالبؔ کا یہ مصرعہ پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اگر علامہ مشرقی نہیں تو خاکسار تحریک ضرور موجود تھی اور غالبؔ خود خاکساروں میں بھرتی ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس مصرعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی میں اُن دنوں خاکساروں کا کوئی ہنگامی جلسہ ہو رہا تھا اس لئے غالبؔ کہتے ہیں کہ آج وہاں یعنی جلسہ میں تیغ و کفن باندھ

کر جاتا ہوں ہو سکتا ہے اُس وقت خاکسار پیلے کی جگہ تیغ اُسترا رکھتے ہوں۔

"لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں"

اس مصرعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب پنجابی بھی جانتے تھے۔ کیونکہ اس میں "نالا" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور نالا پنجابی میں ازار بند کو کہتے ہیں۔ اس مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ جب لوگوں کے پاس پائجامہ یا شلوار میں ڈالنے کے لئے ازار بند نہیں ہوتا تو وہ اس کی جگہ رسا ڈال کر شلوار یا پائجامہ باندھ لیتے ہیں۔ غالب نے اس مصرعہ میں اُس وقت کی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے۔ رسا مشدد تھا لیکن "ضرورت شعری" کے لئے استعمال کر لیا گیا ہے۔

"نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے"

غالب بچپن ہی سے بڑے رنگین مزاج واقع ہوئے تھے اور جوانی میں دھلی کے بانکوں میں قدم رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس مصرعہ میں فلم ایکٹریس نگار سلطانہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کو مستقبل کا بھی علم تھا۔

"جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے"

یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اُس وقت دھلی میں بسیں چلتی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ "قریشی بسیں" نہ ہوں، مگر چلتی ضرور تھیں چونکہ بسوں میں آخری سیٹیں یا بعض بسوں میں اگلی سیٹیں "شاہد نازک خیالاں" کے لئے مخصوص ہوتی ہیں اس لئے ہر شخص اس طرف دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بس ڈرائیور بھی اپنے سامنے چھوٹا سا شیشہ لگا کر "تقریب" کا سامان بنائے رکھتا ہے۔ غالب اس مصرعہ میں یہی کیفیت بیان کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ بس کا جلوہ اتنا رنگین ہے کہ خود بخود اپنی طرف دیکھنے کا تقاضا کرتا ہے۔

"اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے"

بعض لوگ کہتے ہیں کہ غالب کو اپنی بیوی امراؤ بیگم سے انتہائی محبت تھی۔ ہو سکتا ہے یہ بات اپنی جگہ درست ہو گر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غالب کو کسی سے محبت تھی۔ محبت کس سے تھی؟ اس کا جواب اسی مصرعہ میں موجود ہے۔ یہ مصرعہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا معشوق کوئی بھارت کی ایک کم گنتی والی قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ جس کے "جوڑے" میں بڑے پیچ و خم تھے۔ "جوڑا" باندھنے سے وہ غیر معمولی طور پر لمبا ہو جاتا تھا۔ "جوڑے کو کھول دو، تو تمہارے قد کی لمبائی کا سارا بھرم کھل جائے کہ تم کتنے لمبے ہو؟

"اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟"

چونکہ جگر مرادآبادی کا رنگ سیاہ ہے اور چہرے پر گہرے داغ بھی ہیں۔ اس لئے غالب نے "جگر سوختہ" یعنی جلا ہوا جگر کہہ کر ان کی طرف اشارہ کیا ہے اور اپنے نالے سے پوچھتے ہیں کہ یہ جگرِ سوختہ کے نشان کیسے ہیں؟ جبکہ وہ پہلے ہی سوختہ ہے۔ جگر مرادآبادی کے متعلق اُنھوں نے کئی مصرعے لکھے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

"لذتِ ریشِ جگر، غرقِ "نمکداں" ہونا"

چونکہ جگر صاحب کی داڑھی بھی ہے۔ اس لئے غالب کہتے ہیں کہ جگر (مرادآبادی) کی داڑھی کی لذت اُس وقت ہے جب وہ "نمکداں" میں غرق ہو جائیں ورنہ ان کی داڑھی بے کار ہے۔ ایک جگہ غالب نے جگر مرادآبادی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف بھی کیا ہے: ع

کیا کسی نے جگر داری کا دعویٰ؟

"اسی جگر" کے متعلق ان کے کلام میں بہت سے مصرعے ملتے ہیں۔

"رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے"

غالباً اُس وقت کسی مسجد کے لئے چندہ اکٹھا کیا جا رہا تھا اور چندہ اکٹھا کرنے والوں میں غالب بھی شامل تھے۔ غالب نے سوچا۔ چلو اپنے محبوب سے بھی چندہ لیں۔ چنانچہ محبوب کے پاس پہونچے کہ مسجد کے لئے چندہ دو۔ اُس نے آگے سے ٹکا سا جواب دیا۔ اس پر غالب ناراض ہو گئے اور اسی کیفیت کا اظہار انھوں نے اپنے اس مصرعہ میں کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم چندے کے تکلف سے اس شوخ سے کئی روز تک ناراض رہے۔

"جز قیس کوئی اور نہ آیا بروئے کار"

اس مصرعہ سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان دنوں قیس، یعنی مجنوں دہلی آیا ہوا تھا، دوسری یہ کہ غالبؔ نے کار کی سیر بھی کی ہے، گو اس سیر کا ذکر انھوں نے کہیں نہیں کیا مگر اس مصرعہ سے یہی پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ مطلب یہ ہے کہ غالبؔ کسی کی کار میں (کیونکہ ان کی اپنی کار نہیں تھی) بیٹھ کر کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں قیس اور کچھ آدمی ملے۔ ان میں شرط یہ لگی کہ دیکھیں، غالبؔ صاحب کی کار کے آگے کون آتا ہے؟ جب کار قریب آئی تو سب ڈر گئے، مگر قیس، یعنی مجنوں کار کے آگے آگیا۔ قیس کے سوا کوئی کار کے ــــــ یعنی کار کے آگے کوئی نہ آسکا۔

"آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا"

سنا گیا ہے کہ غالبؔ کے وقت پالکیاں رائج تھیں اور عورتیں پالکیوں میں بیٹھ کر آتی جاتی تھیں۔ لیکن غالبؔ کے اس مصرعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت گھوڑے کی سواری بھی عام تھی۔ عورتیں گھوڑوں پر سوار ہو کر آتی جاتی تھیں اور غالبؔ کا معشوق بھی گھوڑے پر سوار ہو کر اس سے ملنے آیا کرتا تھا۔

ایک روز ان کا محبوب گھوڑے پر سوار آرہا تھا کہ راستہ میں دوسرے آشنا نے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور اسے کچھ دیر کے لئے روک لیا۔ غالبؔ کو اس بات کا پتہ چل گیا کہ یہ رقیب کے پاس ٹھہرا ہے چنانچہ محبوب کو طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

یہ مانا کہ تم آرہے تھے۔ مگر تمہارے گھوڑے کی باگ پکڑ کر تمہیں روکنے والا بھی کوئی وہاں موجود تھا۔

فارم نمبر ۴

۱۔ مقام اشاعت	:	حیدرآباد (آندھراپردیش)
۲۔ وقفۂ اشاعت	:	ڈیڑھ ماہ (۴۵ دن)
۳۔ نام ناشر	:	سید مصطفیٰ کمال
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ		۱۷-۶-۲۶۸ دبیرپورہ، حیدرآباد ۲۴
۴۔ نام طابع	:	سید مصطفیٰ کمال
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ		۱۷-۶-۲۶۸ دبیرپورہ، حیدرآباد ۲۴
۵۔ نام مدیر	:	سید مصطفیٰ کمال
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ		۱۷-۶-۲۶۸ دبیرپورہ، حیدرآباد ۲۴

۶۔ نام معہ پتہ: جن کا رسالے، مصطفیٰ کمال ۲۶۸-۶-۱۷ میں ایک فیصد سے زائد حصہ ہے۔ دبیرپورہ، حیدرآباد ۲۴
ممتاز احمد ۲۷ مجرد گاہ
معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱

میں سید مصطفیٰ کمال ذریعہ ہذا اقرار کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اندراجات میری معلومات کے مطابق صحیح ہیں۔

(دستخط) سید مصطفیٰ کمال

مارچ ۱۹۶۹ء

ڈر گیا وہ بھی اب تو ہوٹنگ سے
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

کتے سے ہوشیار
ع — عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے
ع — فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں
موصولہ
مجاریہ
ع — ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

داؤد اشرف

غالب کا حُسنِ طلب اور حُسنِ اعراض

مرزا کی شاعری اور نثر کی نمایاں خصوصیات ان کی دلآویز شخصیت کے کئی پہلو اجاگر کرتی ہیں۔ ان کی عظمت کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ وہ ہر رنگ میں حتیٰ کہ "تصویر کے پردہ میں بھی" اپنے اندر کے حیوان ظریف کو چھپاتے نہیں عریاں کر دیتے ہیں۔

غالب نے شاعری کو قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی سمجھا۔ اپنی شاعری کو عالمی ادب کی عظیم شاعری کے درجہ تک پہنچایا اور ہمارا اہم تہذیبی ورثہ بنا دیا اور مکتوب نویسی کے ابتدائی دور ہی میں انوکھا، رواں اور بے تکلفانہ طرزِ تحریر اختیار کر کے ایسا رنگا رنگ چمن اگایا جس کے پھول اب تک تازہ و شگفتہ ہیں اور بہار دے رہے ہیں۔

میرزا نے پابندی رسم و رہ عام سے ساری زندگی گریز کیا۔ فرسودہ اور روایتی ڈگر پر چلنے کی بجائے جدت پسندی سے کام لیا۔ ان کی یہ خصوصیت ان کے یہاں طلب اور اعراض میں بھی نمایاں ہے۔ راست طور پر وہ کوئی چیز کم مانگتے ہیں۔ ان کے خطوط، شاعری یا لطیفوں میں حسن طلب کی اکثر مثالیں ملتی ہیں۔ اگر طلب راست انداز میں ہو اور مانگنے کا ڈھنگ سادہ اور سپاٹ ہو تو اس میں بے لطفی پیدا ہو جاتی ہے۔ میرزا کی فطری ظرافت و شوخی، بات کہنے کا منفرد ڈھنگ، بات میں بات پیدا کرنے کی کوشش نے طلب میں ایک خاص لطف و خوبی پیدا کر دی ہے اس کے علاوہ ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس خاص انداز میں طلب کرتے ہیں کہ انکار بن نہیں پڑتا۔

میرزا صرف مانگنا اور طلب کرنا ہی نہیں جانتے تھے دوسروں کی ضرورت اور خواہش پورا کرنا بھی خوب جانتے تھے۔ جہاں انہوں نے اپنے رشتہ داروں، دوستوں اور شاگردوں سے سوال کیا ہے۔ وہیں انھوں نے ان لوگوں

یا دیگر اصحاب کی فرمائشیں پورا کرنے میں کبھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ عمر کے آخری حصہ میں بیماری اور ضعف پیری کے باوجود بستر پہ لیٹے لیٹے شاگردوں کا بھیجا ہوا کلام پڑھتے اور اصلاح دیتے۔ اپنے دوستوں اور شاگردوں کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ ان کی خوشی پر مسرور اور ان کے دکھ درد پر رنجیدہ ہو جاتے تھے۔ بعض اوقات ان کے احباب اور شاگرد ایسی فرمائشیں کر بیٹھتے تھے جنھیں پورا کرنے میں کسی وجہ سے انہیں تامل ہوتا تو ایسی صورت میں وہ ایک خاص انداز میں پہلو بچانے کی کوشش کرتے۔ کیونکہ وہ محبت اور مروت کے پیکر تھے اور اپنی کسی بات سے دوسروں کو رنجیدہ نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس لئے وہ جواب میں عام طور پر صاف انکار سے پرہیز کرتے ہیں اور بات ٹالنے کے لئے کوئی نہ کوئی دلچسپ نکتہ ڈھونڈ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ جب کسی کی فرمائش پورا کرنے میں وہ خود کو معذور پاتے ہیں یا کسی کے ارادہ کو ناپسند کرتے ہیں تو ایسی صورتوں میں مکتوب الیہ کو فرمائش یا ارادہ سے باز رکھنے کے لئے مشورہ و نصیحت کرتے ہیں۔ لیکن ان کا مشورہ کڑوی دوا کی مانند نہیں ہوتا جسے پینے سے منہ کا ذائقہ بگڑتا ہے یا منہ بنانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ بات ظرافت کے پردے میں کہتے ہیں تاکہ ناگوار نہ گزرے اور بدمزگی پیدا نہ ہونے پائے۔

ظرافت غالب کی شخصیت کا ایک اہم ترین وصف ہے۔ شوخی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ یہ شوخی و ظرافت خاص خاص موقعوں اور موضوعات کی پابند نہیں۔ میرزا کسی بھی واقعہ یا بات میں اس کے مضحک یا تفریحی پہلو ابھارتے ہیں۔ دکھ درد مصائب کا تذکرہ ہو کہ رنج و افسردگی کا بیان، ان کا قلم، شوخی اور روانی کو نہیں بھولتا۔ غم کے موقع پر آزردہ اور رنجیدہ خاطر ہو کر وہ آہ و بکا نہیں کرتے بلکہ اس میں مزاح کا پہلو نکال کر غم کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بستر علالت اور بستر مرگ سے بھی جو خطوط انہوں نے تحریر کئے ہیں ان میں میرزا کی فطری ظرافت اور شگفتگی اپنا جوہر دکھاتی ہے۔ سخت سے سخت اور مشکل سے مشکل حالات میں مذاق کا سوجھنا غالب جیسے حیوان ظریف ہی کا حصہ ہے ان کے اُردو خطوط کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے مکتوب الیہ کو خوش کرنے اور اس کے دل بہلانے کا التزام کیا ہے۔ اس سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ میرزا کو اس اہم سماجی ذمہ داری کا پورا پورا احساس تھا اور وہ اس ذمہ داری سے پوری کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ میرزا نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ وہ اس سے بھی چند قدم آگے نکل گئے ہیں۔ دوسروں کا مذاق اڑانا آسان ہے لیکن خود پر ہنسنا یا خود کو مذاق کا نشانہ بنانا اعلیٰ ظرفی اور بلند حوصلہ کی بات ہے۔

ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس "حیوان ظریف" کی فطری ظرافت طلب اور اعراض میں ان کا ساتھ دیتی ہے۔ دیکھئے آیا وہ اونچی آواز اور کرخت لہجے میں صدا بلند کرتے ہیں یا دلچسپ اور دل لبھانے والے انداز میں سوال کر کے حاجت روا کو مسرور اور مسخر کر لیتے ہیں۔ کسی کی فرمائش کو بے مروتی سے رد کر دیتے ہیں یا ظریفانہ انداز اختیار کر کے پہلو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں طلب اور اعراض میں بھی ظرافت، شگفتگی اور ذہانت جلوہ گر ہے جس میں مزاح کی ہلکی ہلکی آمیزش، شگفتگی اور جدت پسندی نے ایک انوکھا پن پیدا کر دیا ہے۔

شاعری میں وہ "در کعبہ وا" نہ ہونے پر ضرور لوٹ آئیں گے ـــــ لیکن اپنے خطوط میں اور خصوصیت کے ساتھ

طلب یا اعراض کے لمحوں میں وہ زندگی کے حقائق اور واقفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ حاجت روا کا دروانہ ہونے پر اسے بار بار کھٹکھٹانے کی حرکت کرسکتے ہیں۔ ان لمحوں میں شخصیت سے فرار بھی ممکن ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا ان لمحوں میں وہ اپنے رکھ رکھاؤ اور وضع داری کو نبھاتے ہیں یا صرف غرض مند سوالی یا بے مروت بن جاتے ہیں شاعری کے مقابلہ میں خطوط کے توسط سے غالب کی شخصیت کردار اور زندگی کو سمجھنے میں زیادہ مدد ملتی ہے۔ طلب اور اعراض کے مواقع اس معاملہ میں خصوصیت کے ساتھ زیادہ اہمیت کے حامل بن جاتے ہیں۔ یہاں تصنع، بناوٹ، خوشامد پسندی ظاہر داری اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ ظرفی، طبیعت کی فطری شوخی، خودداری، انا، مزاج کا بانکپن اور لہجہ کی شگفتگی غرض یہ کہ یہ تمام خصوصیات اور ان کے تضادات کا تجزیہ اور یہ طے کرنا کہ آیا یہ حالات کی ستم ظریفی غالب جیسے ایک عظیم فن کار کی ٹریجڈی، مایوسی اور محرومی کو ظاہر کرتی ہے یا ان کی شخصیت کے کھوکھلے پن اور قول و فعل کے تضاد کو بے نقاب کرتی ہے ایک علٰحدہ موضوع ہے۔ یہ مضمون طلب و اعراض کی صرف اس خصوصیت تک محدود ہے جو اس "حیوان ظریف" کی فطری شوخی، مانگنے اور انکار کرنے کے دلچسپ سلیقہ شگفتہ انداز اور ان سب پر چڑھے ہوئے ہلکے ہلکے ظرافت کے رنگ سے متعلق ہے۔ جس پر کہیں کہیں تیکھے طنز کی چمک ملتی ہے مزاح کے گل بوٹے بھی جس پر منقش ہیں۔ یہی غالب کی منفرد خصوصیت ہے۔ سپاٹ یا بناوٹی قسم کے روایتی انداز سے ہٹ کر انہوں نے جداگانہ روش یہاں بھی اختیار کی ہے اسی انوکھے پن نے ان کی نثر میں شعر کی سی مترنم روانی پیدا کردی ہے۔

حسن طلب اور حسن اعراض کی چند مثالیں جو کہ بیشتر خطوط سے لی گئی ہیں پیش خدمت ہیں۔

علاء الدین احمد خاں کے نام یہ خط حسن طلب ہی کا نہیں غالب کی دلکش طرز تحریر کا ایک بہترین نمونہ ہے خط ملاحظہ فرمائیے:

"یہاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھے گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں تمہاری پھوپی کہتی ہیں۔ ہائے دبی، ہائے مری۔ دیوان خانہ کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا فقدان راحت سے گھبراتا ہوں۔ چھت چھلنی ہے ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے تو مرمت کرے تو کیوں کر کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں، میں بیٹھا کس طرح رہوں؟ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی، جس میں میر حسن رہتے تھے اپنی پھوپی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالان زیریں جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا میرے رہنے کو دلوادو۔ برسات گذر جائے گی مرمت ہوجائے گی پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ[1] اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ تمہارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں ایک یہ مروت کا احسان میرے پایان عمر میں اور بھی سہی"[2]

---

[1] غالب ان کی بیگم اور بچے

[2] خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر ص ۸۹

اس خط میں طنز، ظرافت اور ہجو کا انداز ملتا ہے۔ یہ ہجو کسی اور کی نہیں ان کے اپنے مکان کی ہے اس طرح یہ اپنے حال زار پر ہنسنا بھی ہے۔ بیان کا انداز ظریفانہ ہے۔ غالب کا یہ بیان کہ مرنے سے نہیں ڈرتے فقدان راحت سے گھبراتے ہیں۔ ان کے کردار اور وضع داری کی طرف اشارہ ہے۔ اس خط میں گذارش احوال واقعی" اور انداز طلب دونوں باوقار ڈھنگ سے ملتے ہیں۔

غالب نے کسی نواب کے یہاں سے اپنے خط اور قصیدہ کا جواب نہ آنے پر ایک دلچسپ قطعہ لکھا ہے جو حسن طلب کا ایک شاہکار ہے۔ اس قطعہ میں انہوں نے ایک چھوٹی سی تمثیل بنائی ہے۔ اس تمثیل میں غالب مایوس ہو کر اپنی عقل کو مخاطب کرتے ہیں کہ وہ شمع چراغ ہفت ایوان ہے۔ اسے تو کچھ خبر ہوگی کہ خط کا جواب کیوں نہیں آیا۔ غالب کے استفسار پر جو خط اور قصیدہ لکھنے پر پشیمان تھے عقل نے جواب دیا شیطان کا فریب نہ کھاؤ اور مایوس نہ ہو۔ اصل میں نواب ارمغان کی فکر میں ہے۔ اور جو کچھ وہ دینا چاہتا ہے اس کے اکٹھا کرنے میں دیر ہو رہی ہے نواب نے تو یہ فرمان جاری ہی کر دیا ہے کہ بحر و بر کے تمام راستوں سے پوری کوشش کر کے دمشق سے دیبا، روم سے مخمل، معدن سے الماس، کان سے سونا، دکن سے ہاتھی، کوہستان سے زمرد، عراق سے گھوڑا، عمان سے موتی، نیشاپور سے فیروزہ، بدخشاں سے یاقوت بغداد سے اونٹنی، اصفہان سے تلوار، کشمیر سے پشمینہ، ایران سے زربفت فراہم کر کے لائیں۔ ظاہر ہے اس سارے اسباب کے اکٹھا کرنے میں دیر ہوتی جا رہی ہے۔ جب عقل نے انھیں اس طرح تسلی دی تو ان کی مایوسی امید میں بدل گئی اور وہ اپنے دل میں کہتے ہیں کہ جب ممدوح میرے لئے یہ سب کچھ کرنا چاہتا ہے تو میں بھی اس کے لئے سکندر سے تاج اور آئینہ سلیمان سے تخت اور انگوٹھی، عالم غیب سے جام جمشید، چشمہ خضر سے آب حیوان، عمر ابد، نشاط جاوید، دل کی توانائی اور ایمان کی سلامتی اپنے خدا سے اور اپنی عرضی کا جواب اور قصیدہ کا صلہ ممدوح سے کیوں نہ مانگوں"[1]

میرزا آموں کے بہت دلدادہ تھے۔ آم کے موسم میں ان کے دوست احباب انہیں عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے اور وہ خود بھی دوستوں سے آم بھیجنے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ میرزا نے جو فارسی خط علی اکبر متولی امام باڑہ ہگلی بندر کو آموں کی طلب میں لکھا تھا وہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ لذت اور چاشنی میں آم سے کچھ کم نہیں

"کسی قدر پیٹ کا بندہ ہوں اور کسی قدر ناتواں۔ آرائش خواں چاہتا ہوں اور آرائش جان بھی عقلمند جانتے ہیں کہ یہ دونوں صفتیں آم کے اندر موجود ہیں اور اہل کلکتہ کا دعویٰ ہے کہ ہگلی بندر قلمرو انبہ ہے۔ ہاں ہگلی سے آم گلشن سے گل جناب سے ایثار، اپنی جانب سے سپاس، شوق یہ چاہتا ہے کہ ختم موسم تک دو تین بار خاطر ولی نعمت سے یہ بات گزرے اور حرص یہ رو رہی ہے حاشا اس قدر میوہ خوری پر بھی ملی خورش نہیں ہوگی"[2]

غالب نے کہا تھا

---

[1] سبد چیں سے ترجمہ، (طبع اول ص۲۶)

[2] پنج آہنگ سے ترجمہ

اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

اس خط میں یہی خواہش آم کے تعلق سے اور آم بھیجنے والے کے تعلق سے پائی جاتی ہے۔ طلب کرنے کا یہ انتہائی دلچسپ انداز ہے اس حسن طلب کے کیا کہنے

"ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ جن میں میرزا بھی تھے باغ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لدرہے تھے۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہیں آسکتا تھا۔ میرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟ ہاتھ باندھ کر عرض کیا "پیر و مرشد جو کسی بزرگ نے کہا ہے

برسرِ ہر دانہ بنوشتہ عیاں
کاین فلاں ابن فلاں ابن فلاں

اسکو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں" بادشاہ مسکرائے اور اسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی۔" [۱]

اس واقعہ میں ہی حسن طلب کی داد بہادر شاہ ظفر کی طرف سے مرزا کو آموں کے تحفے کی شکل میں مل جاتی ہے۔ غالب اپنے حسن طلب کے ذریعہ کیا حاصل نہیں کر سکتے۔

نواب یوسف علی خاں بہادر نے حیدر علی خاں بہادر کی شادی کے موقع پر خلعت و تورہ کے لئے میرزا کو ۲۵۰ روپے بھیجے تھے۔ میرزا نے ان روپیوں کو خرچ کر لیا اور آئندہ کی سبیل نکالتے ہوئے لکھتے ہیں،

"یہ تحریر نہیں مکالمہ ہے۔ گستاخی معاف کروا کے اور آپ سے اجازت لے کے بطریق انبساط عرض کرتا ہوں کہ یہ سوا سو روپے جو تورہ و خلعت کے نام سے مرحمت ہوئے ہیں، میں کال کا مارا اگر یہ سب روپیہ کھا جاؤں گا اور اس میں لباس نہ بناؤں گا تو میرا خلعت حضور باقی رہے گا یا نہیں ؎

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

دار کا طالب
غالب [۲]

یہ دلچسپ طرز تحریر واقعی تحریر نہیں مکالمہ ہے۔ طلب میں مزاح کا پہلو انوکھا بھی ہے اور موثر بھی۔ ایسے حسن طلب کے بعد

---

[۱] یادگار غالب از حالی ص ۵۲

[۲] مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، طبع سوم ص ۲۱
مکتوب نواب فردوس مکان مکتوب نمبر ۲۴

شاید ہی کوئی انکار کرے۔

نواب یوسف علی خاں بہادر والی رامپور کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں بہادر مسند نشین ہوئے میرزا کلب علی خاں بہادر کی مسند نشینی کی مسرت میں قصیدہ تہنیت لکھ بھیجا تھا لیکن وہاں سے صلہ پانے میں تاخیر ہوئی تو وہ والی رامپور کو لکھتے ہیں۔

"پیر و مرشد! حضرت فردوس مکان کا دستور تھا کہ جب میں قصیدہ بھیجتا اس کی رسید میں خط تحسین و آفرین کا، شرم آتی ہے کہتے ہوئے مگر کہے بغیر بنتی نہیں، مالصہ کی ہنڈوی اس خط میں ملفوف ہوا کرتی تھی۔۔۔۔ یہ رسم بری نہیں ہے اگر جاری رہے تو بہتر ہے" لہ

اس خط میں طلب تقاضہ بن چکی ہے لیکن طلب کا انداز شاعرانہ ہے۔

"یہ رسم بری نہیں اگر جاری رہے تو بہتر ہے" سے خودداری ٹپکتی ہے۔ غالب طلب اور تقاضا کے شدید لمحات میں اپنے مقام اور مرتبہ کو یکسر فراموش نہیں کر دیتے۔

میرزا قرضوں کے باعث بے حد پریشان رہا کرتے تھے۔ والی رامپور نواب کلب علی خاں بہادر سے وہ راحت کے طلبگار رہیں ان سے وہ نہ صرف قرض کی ادائی کی رقم مانگتے ہیں بلکہ مستقل تنخواہ میں بھی اس قدر اضافہ چاہتے ہیں کہ انہیں اپنے اخراجات کی پابجائی کے لئے آئندہ قرض نہ لینا پڑے۔ خط ملاحظہ کیجئے :

حضور ملک و مال جس کو جس قدر چاہیں عطا کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے صرف راحت مانگتا ہوں اور راحت منحصر اس میں ہے کہ قرض باقی ماندہ ادا ہو جائے اور آئندہ قرض لینے کی حاجت نہ پڑے لہ

ان دو جملوں میں بات کہنے کا سلیقہ ہے۔ طلب ہے لیکن باوقار انداز اور میرزا کے مخصوص شگفتہ انداز اور لہجہ میں نثر میں یہ طلب "شاعری" سے کم نہیں۔

عارف کے چھوٹے بیٹے حسین علی خاں کی شادی کے اخراجات کے لئے میرزا نے نواب کلب علی خاں کے پاس درخواست بھیجی تھی۔ شادی رجب میں مقرر تھی جواب نہ ملنے پر ملتوی کر دی گئی۔ میرزا ۹ رمارچ ۱۸۶۸ء کو تقاضا کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" میرزا حسین علی خاں کی شادی رجب کے مہینے میں قرار پائی تھی۔ عطیہ حضور کے نہ پہنچنے کے سبب ملتوی رہی۔ آج جو ذیقعدہ کی ۱۵ ہے۔ ۱۵ دن یہ اور مہینا ذی الحجہ کا۔ اگر اسی ذیقعدہ کے مہینے میں کچھ حضرت عطا فرمائیں گے تو آخر ذی الحجہ تک نکاح ہو جائے گا۔ خدا کرے! خداوند کے ضمیر میں یہ بھی گذرے کہ غالب جب بہو بیاہ لائے گا تو اس کو روٹی کہاں سے کھلائے گا۔ غرض اس سے یہ ہے کہ حسین علی خاں کی تنخواہ جاری ہو جائے۔ حضرت! کوئی ایسا

لہ مکاتیب غالب از مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی طبع سوم صفحہ ۳۷

لہ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ صفحہ ۶۰

نہیں کہ جو میرے مطالب حضور میں عرض کرتا ہے اور مجھے بار بار لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

اس خط سے شدید ضرورت، حاجت اور توقع کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اس کے باوجود میرزا نے روایتی انداز اختیار نہیں کیا۔

وہ ہر حال میں "میرزا ہی تو نکلے"

حالی نے یادگار غالب میں جو واقعہ 'لطیفہ' کے زیر عنوان بیان کیا ہے وہ حسن طلب کی ایک مثال ہے۔

"ایک دن دیوان فضل اللہ خاں مرحوم چیپ میں سوار میرزا کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ میرزا کو معلوم ہوا تو انھوں نے ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا۔ "آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہوسکتی ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اس طرف سے گذریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں۔ جب یہ رقعہ دیوان جی کے پاس پہونچا وہ بہت شرمندہ ہوئے اور اسی وقت گاڑی میں سوار ہوکر مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔"[1]

اس واقعہ میں غالب کے طنز کا تیکھا پن ملتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ندامت غالب کو نہیں ہوئی بلکہ فضل اللہ خاں صاحب کو ہوئی اور غالب کے طنز نے ان میں شدید رد عمل پیدا کرنے کی بجائے کچے دھاگے سے باندھ کر انھیں غالب کے یہاں پہنچا دیا۔

میرزا نے ایک بار تفضل حسین خاں سے اپنا دیوان مانگا تھا۔ دیوان نہ دئے جانے پر خفا ہوجاتے ہیں اپنی ناخوشی کا نہایت شائستگی کے ساتھ اظہار کرتے ہوئے دیوان دوبارہ طلب کرتے ہیں

"کیوں صاحب

یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی اور استادی سب پر پانی پھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے، میرا کلام خرید آٹھ دس روپیہ کی سو وہ بھی میں نہیں کہتا کہ مجھ کو دے ڈالو تم کو مبارک رہے۔ مجھ کو مستعار دو۔ میں اس کو دیکھ لوں، پھر تم کو واپس بھیج دوں۔ اس طرح کی طلب پر نہ دینا دلیل اس کی ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے ہو۔ میرا اعتبار نہیں یا یہ کہ مجھ کو آزار دینا اور ستانا بدل مطلوب ہے۔ وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دے دو۔ باللہ واللہ اس میں جو میرے نہیں ہے نقل کر کے تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت اور تم میری قسم نہ مانو اور کتاب حامل رقعہ کو نہ دو تو تم کو آفریں ہے"[2]

یہ خط جداگانہ نوعیت کا ہے اور اس خط کی تحریر بھی غالب کی نثر کے اچھوتے انداز کی نمائندہ تحریر سمجھی جاسکتی ہے۔ اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جن موقعوں پر آدمی جھلا اٹھتا ہے وہاں بھی غالب نے اپنے مزاج کے اعتدال اور

---

[1] یادگار غالب از الطاف حسین حالی ص ۱۵

[2] خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر ص ۳۳۵

شگفتگی طبع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیاہے۔ طنز بھی کرتے ہیں تو گراں نہیں گذرتا اور کسی کے جذبات مجروح نہیں ہوتے
منشی ہرگوپال تفتہ فارسی کے شاعر اور میرزا کے بہت عزیز شاگرد تھے۔ اردو میں غالب کے سب سے زیادہ خطوط ان ہی کے نام ہیں۔ انھوں نے ایک بار میرزا سے اپنے دوسرے دیوان پر تقریظ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ اس کے جواب میں میرزا نے جو مکتوب لکھا تھا وہ میرزا کا شاعری کی جانب جو رویہ تھا اس کی واضح طور پر ترجمانی کرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ شاعری قافیہ پیمائی کے لئے وقت گزارنے یا دل بہلانے کی خاطر کی جائے۔ وہ شاعری کے لیے غور و فکر، چھان پھٹک اور خود احتسابی ضروری سمجھتے تھے۔

اس خط میں خاص بات یہ ہے کہ تلقین و تنقید سے متعلق اتنی وزنی باتیں اور اس درجہ بیش قیمت مشورے دلچسپ اور برجستہ انداز میں ملتے ہیں۔ یہاں صاف گوئی بھی ہے اور کھری کھری باتیں بھی لیکن اس مخلصانہ انداز میں کہ دل ٹوٹنے نہ پائے۔

" صاحب!

دیباچہ اور تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان لکھ لینا۔ کیوں روپیہ خراب کرتے ہو اور کیوں چھپواتے ہو؟ اگر یوں ہی جی چاہتا ہے تو ابھی کہے جاؤ، آگے چل کر دیکھ لینا۔ اب یہ دیوان چھپوا کر اور تیسرے دیوان کی فکر میں پڑوگے۔ تم دو چار برس میں ایک دیوان کہہ لوگے۔ میں کہاں تک دیباچے لکھا کروں گا؟ مدعا یہ ہے کہ اس دیوان کو اس دیوان کے برابر ہو لینے دو اب کچھ قصیدہ اور رباعی کی فکر کیا کرو۔ دو چار برس میں اس قسم سے جو کچھ فراہم ہو جائے، دوسرے دیوان میں اس کو بھی درج کرو۔[1]

نواب علاء الدین خاں علائی نے میرزا سے اپنے لڑکے کی ولادت کی تاریخ اور اس کا اسم تاریخی نظم کرنے کی فرمائش کی تھی اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

" شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے طریق صید افگنی سکھاتا ہے جب وہ جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخن ور ہو گئے۔ حسن طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پیر غمزدہ دل کو تکلیف دو! علاء الدین خاں، تیری جان کی قسم، میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیئے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نہ صاحب، دہائی خدا کی، میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا، نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔[2]

---

[1] خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر ص ۱۵۱
[2] خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر بار سوم ص ۶۶

یہ خط پکار پکار کر کہتا ہے کہ میرزا جدید اردو نثر کے بانی و خالق تھے۔ اتنی رواں اور حسن و معنی لئے ہوئے نثر آج بھی کاہے کو دیکھنے کو ملے گی۔ یہ میرزا کا منفرد اسٹائل ہے۔ یہاں انکار ہے پہلو تہی ہے لیکن کس خوبی کیساتھ۔ انکار میں ان کی تحریر پانے والا انکار کے باوجود اپنے آپ کو خوش نصیب تصور کرسکتا ہے۔ کیونکہ اس خط میں میرزا کے طنز و مزاح۔ بیساختہ اور دل کو لبھانے والا انداز بیان غرض یہ کہ سب کچھ مل جاتا ہے۔

غالب کی شاعری ہو کہ نثر اور ان میں طلب ہو کہ اعراض

" کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور"

●●●

" اردو شاعری میں غالب پہلے شخص ہیں جنہوں نے طنز میں خدا کو مخاطب کیا ہے۔ طنز ظاہر ہے اطمینان و انبساط کا حقہ نہیں ہے۔ اس کو اکسانے والی چیزیں تنقیص و نفرت، بیزاری و بغاوت، ناکسی و ناداری یا تہتک و تضحیک ہوگی۔ طنز کی بلندی و پستی کا مدار اس پر ہے کہ طنز کرنے والا کس سطح سے اور کس مقصد کو مدنظر رکھ کر طنز کے حربہ کو کام میں لا رہا ہے۔

.... اردو شعر و ادب میں غالب طنز و ظرافت کے (اصلی معنوں میں) بانی ہوئے اور طنز و ظرافت کے معاملے میں وہ اپنے عہد کے ایرانی شعراء سے زیادہ ثقہ۔ شائستہ اور پرفن تھے۔ اس کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ غالب طنز و ظرافت کا وار معمولی یا روایتی ادارہ یا شخصیتوں پر کرنے کے اتنے شائق نہ تھے۔ وہ اس کو اپنا ہدف نہیں بناتے جو خود زندگی اور زمانے کا ہدف ہوتا بلکہ براہ راست اور بڑے اعتماد سے اس کو مخاطب کرتے تھے جس کا ہدف خود زندگی اور زمانہ ہوتا یعنی خالق ارض و سما اور یہ دلیل تھی فن اور فن کار دونوں کے عظیم المرتبت ہونے کی ...

زندگی سے غالب کا واسطہ بلا واسطہ اور براہ راست تھا۔ بیشتر شعراء کے وطیرے کے خلاف وہ زندگی سے نبرد آزما پہلے ہوتے تھے۔ شاعری سے اختلاف بعد میں کرتے تھے وہ شاعری میں اپنے تاثرات بیان کرنے کے اتنے زیادہ قائل نہیں تھے۔ جتنے اپنے تجربات بیان کرنے یا فیصلہ کرنے میں جری تھے۔ اور یہ وہی کر سکتا ہے جس کی گرفت زندگی پر ہو نہ کہ وہ جو زندگی یا خود شاعری کی گرفت میں ہو ... غالب نے ایک مضبوط چٹان کی طرح لہروں کو طوفان اور طوفان کو لہروں میں منتقل ہوتے دیکھا اور اس کھیل کو بازیچہ اطفال سمجھ کر ماضی اور مستقبل کے تحسین اور تفتیش میں پڑنے کی بجائے حال کے مسائل و مطالبات کو سنوارتے رہے۔

(رشید احمد صدیقی)

مرزا انوشہ

عقد نامہ

عقد سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عقدِ نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عقد کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عقد گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عقد خلل ہے دماغ کا

سو بار بندِ عقد سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

سفرِ عقد میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا

بیدادِ عقد سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

ہوگئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عقد کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

بے عقد عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

ہوا ہوں عقد کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

وفا کیسی، کہاں کا عقد، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

عقد نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

سختی کشانِ عقد کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

عقد نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عقد میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے مجھ سے

بھارت چند کھنہ

دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

rekhta

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں گے مگر کھائیں گے کیا

بجا ارشاد فرمایا ایسے [...]گوں کے لئے ہجن کے پاس سوائے [...]یع کے اور کوئی چیز گرانقدر باقی [...]ہیں رہی مناسب ہے کہ اگر دلی [...]ں رہنا ہو تو غم الفت کی جگہ خالص [...]م کھائیں۔ ممکن ہے ایک چیز آپ [...] پریشانی اور ملاوٹ کے بغیر ملتی [...] ہے۔ اس کے علاوہ گرمیوں میں [...]ھوپ اور سردیوں میں پالا اور [...] بھی کھائے جا سکتے ہیں۔

[...] جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟

یہ الیکشن کے زمانہ کی بات [...]۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب [...]لا امتیاز سب کو بلا کر سمجھا کر بجا کر منا کر ووٹ اکھٹے کرتے کا کام سیر کرنا ہوتا ہے۔ یہی ایک وقت ایسا ہوتا جب نیتا پبلک کے رہین منت اور ان کی عنایت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ الیکشن کے بعد پانچ سال تک ان کو بالائے طاق رکھا جا سکتا ہے مگر الیکشن کے عین پہلے طوق زریں کے لئے خیرِ عیسیٰ کو بھی قبلہ و کعبہ بنا لیتے ہیں کوئی امر مانع نہیں ہوتا۔

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں؟

زمانہ پر آشوب گمانی کا ہے۔ غیر ملکوں سے ہر ملک کے لوگ نالاں ہیں اس لئے مناسب ہوگا اگر اپنے ہی وطن کی اپنی لسانی ریاست میں ریاستی زبان میں عرضیاں لکھ کر مختلف محکموں میں دیدو ایمپلائمنٹ اکسچینج کے کارڈ کو راشن کارڈ کی طرح چالو اور تازہ رکھو۔ اپنی علم خوبیوں کے علاوہ خود کو علم جوتش کا عالم بتلاؤ۔ عرضی گزارتے وقت وزراء کی قسمت کا حال بتاؤ جس میں یہ دھان منتری بن جانے کے عناصر کا ظہور، پردیس میں کسی وفد کی قیادت کا ذکر اور کسی خزانے کے مل جانے کی بات بھی شامل ہو۔

غرض کہ اپنا جال بڑی خوبی سے بچھاؤ۔ محکموں کے افسروں پر دباؤ ڈلواؤ۔ پیروی کے لئے جاؤ۔ اپنی ڈگریوں کا حوالہ دو۔ اپنے رشتہ داروں کی داستان درد انگیز لہجہ میں بیان کرو۔ موقعہ پاکر بھی واضح کر دو کہ فلاں شخص جو جنگ آزادی میں قید ہوا تھا وہ اصل آپ کے والد صاحب کی بہن صاحبہ کے سسر کی ماں کا پوتا تھا۔

اپنے مذہب کا حوالہ دو جیالا مکھی

کی طرح پھوٹو۔ کچھ دعوتیں دے ڈالو کھدر ٹوپی پہن لو اور اون کا دوشالہ اوڑھ کر منظر عام پر آؤ۔ اپنی شکل وصورت ایسی بنالو کہ دور سے ہی پہچانے جاؤ گو ایسا کرنے سے آپ کا حلیہ ہی کیوں نہ بگڑ جائے۔ وقت موقعہ دیکھکر نیتاؤں کے گلے میں پھولوں کے ہار پہناؤ۔ پیروں پہ گر گر کر گریہ وزاری کرو، ان کیلئے مجسم مصیبت بن جاؤ، تاکہ محض پیچھا چھڑانے کی غرض سے وہ آپ کی غرض پوری کردیں۔ پھلنے پھولنے اور پھیلنے کے لئے ان مجرب نسخوں کو ہمیشہ، یاد رکھو!

کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

کسی خاص وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ راہ گزر کے موڑ پہ راشن کی دوکان ہے جہاں سے شکر اور کیروسین حاصل کرنے کیلئے کیو میں کھڑا رہنا ضروری ہے۔

آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا؟

کیوں نہیں۔ واہ صاحب یہ بھی کوئی بات ہے۔ البتہ ترکش کی شکل آج کل بدل گئی ہے۔ یہ ہینڈ بیگ کی شکل میں کندھے سے لٹکایا جاتا ہے یا ہاتھ میں تھاما ہوا ہوتا ہے۔ اس ترکش میں لپ اسٹک پاوڈر، غازہ (MASCARA) وغیرہ سب ہی کچھ ہوتا ہے گاہے بگاہے اس کی مدد سے تیر چلائے جاتے ہیں۔ اگر لیلیٰ اس زمانے میں پیدا ہوتی تو اس کا رنگ دیکھنے والوں کو، شب دیجور کی یاد نہیں بلکہ تازہ گلاب کی رنگت کا سا دکھائی دیتا۔ مخفی مباد کہ نئی زمانہ کسی شوخ کا اصلی رنگ روپ اس کے منہ دھونے کے فوراً بعد ہی معلوم ہوسکتا ہے۔

کون لا سکتا ہے تاب جلوۂ دیدار دوست

صرف دو ہی صورتوں میں اول یہ کہ جلوہ دیدار دوست گہرے سبز رنگ کی عینک میں سے کیا جائے یا پھر جلوہ کنندہ بھوک سے اس قدر بیتاب ہو کہ دیدار دوست اس کو گرم گرم تندور کی روٹی نظر آئے۔

ہجوم گریہ کا سامان کب کیا میں نے

جب نوکر بغیر نوٹس دیئے ملازمت چھوڑ گیا، جب مالک مکان نے کرایہ کا گھر خالی کرنیکا نوٹس دیدیا۔ جب راشن کی دوکان پر راشن کے بجائے بھاشن ملا جب نیا مالیہ سال نئے ٹیکسوں کو لیکر آگیا جب اپریل کے مہینہ میں موٹر رجسٹریشن ٹیکس زندگی اور موٹر کے بیمہ کی ادائیگی کا وقت آن پہنچا۔ جب دھوبی نے میری نئی قمیص پھاڑ ڈالی اور جب بیوی نے ساڑیوں کے نئے ڈیزائنوں کا اشتہار دیکھ لیا۔ جب نل کھولنے پر اس میں صرف سسکیوں کی سی آواز نکلی جب ایک منحوس صبح موٹر اسٹارٹ کرنیکی کوشش کرتے ہوئے معلوم ہوا کہ اس کی بیٹری کی روح رات میں قفس عنصری سے پرواز کرچکی تھی!

جانا کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر

معاف فرمایئے مرزا صاحب مجھے جناب کی رائے سے اتفاق نہیں۔ مندرجہ ذیل صورتوں میں دل کی بات کہے بغیر معلوم ہوجاتی ہے۔

جب مہینہ کی پہلی تاریخ کو مالک مکان کا کارندہ کرایہ کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ جب ریل کا بکنگ کلرک آپ کی سیٹ محفوظ کرتے ہوئے آپ کی طرف دلی نظروں سے دیکھتا ہے۔ جب بس میں چڑھنے کے بعد بس کنڈکٹر پاس آکر کھڑا ہوجاتا ہے۔ جب بڑے صاحب کا چپراسی بڑے صاحب سے ملاقات کے بعد نیم مسکراہٹ سے میری طرف دیکھتا ہے۔ جب ہوٹل کا ویٹر ٹپ نہ ملنے پر میری طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ جب نوکری کے انٹرویو میں ناقابل جواب سوال پوچھے جاتے ہیں۔ جب کسی تہوار کے بعد پوسٹ مین یا تار گھر کے عملہ کے لوگ دروازہ پر آکھڑے ہوتے ہیں جب عورت کچھ کہنے پر خاموش رہتی ہے۔

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر

اس لئے کہ دھوپ اور گرمی سے رخ یار کا غازہ پگھل چکا تھا۔ اور چہرے کی اصلی "خوبیاں" ظاہر ہوگئیں تھیں۔ نیز اس لئے بھی کہ محدود آمدنی سے لامحدود گرانی کا مقابلہ کرنے کی تشویش نے رُخ یار کی خوبیاں یکسر جلادی تھیں۔

"کب سے ہوں کیا بتاؤں اس جہان خراب میں"

یہ بھی کوئی راز کی بات ہے۔ تاریخ حصول آزادی سے۔

"میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں"

"الف" یہی کہ محکمہ ہذا میں کوئی جائیداد خالی نہیں۔

"ب" اس سے پہلے جو راشن تمہارے لئے منظور کیا گیا ہے اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا۔

"ج" اگر سوال یہ کہا جائے کہ ہندوستان کی تاریخ میں پرتھوی راج کے متعلق تم کیا جانتے ہو تو

یقیناً جواب میں یہ لکھا جائے گا۔ کہ وہ شمی کپور کا باپ تھا۔ یا اگر انگریزی کے پرچے میں یہ سوال کیا جائے کہ ۱۹۶۷ کا برعکس کیا ہوگا تو جواب لکھا جائے گا: "پچھلی"

"د" جامعہ کے حکام نے اسٹوڈنٹس یونین سے مشورہ کیے بغیر بی اے کے امتحان کی تاریخ کا اعلان کرکے نہایت غیر ذمہ دارانہ طریقۂ کار کا ثبوت دیا ہے۔ اس لئے جامعہ کے حکام مقتدر کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ فوراً سے پیشتر اپنے اس اعلان کو واپس لے لیں کیونکہ طلبا فی الوقت امتحان کے موڈ میں نہیں ہیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو نہ صرف تمام اہم عہدہ داروں کا گھیراؤ کیا جائے گا بلکہ ہر اس مقام کو جہاں امتحان جا سکتا ہے ناقابل استعمال بنا دیا جائیگا۔ علاوہ ازیں اسٹوڈنٹس یونین نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ جب بھی امتحان کی تاریخ یونین کی مرضی کے مطابق مقرر کی جائے تو اس سے قبل ممتحنوں کی ایک فہرست یونین کی خدمت میں روانہ کر دی جائے تاکہ یونین کی عاملہ کمیٹی کے ارکین ممتحنوں سے ربط پیدا کرکے ان کو سوالات کے متعلق مناسب مشورہ دے سکے مخفی مبادا کہ ایسا کرنے سے دوران امتحان کسی قسم کی بدنظمی اور افراتفری پیدا نہ ہو سکے گی۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو دوران امتحان پیدا ہونے والے واقعات اور حادثات کی تمام تر ذمہ داری جامعہ کے حکام مقتدر کے سر پہ ہوگی۔

"ز" اگر آپ کسی اردو ادبی رسالے کے لائف ممبر بن چکے ہیں اور پورا چندہ بھی رکنیت کا گذران چکے ہیں تو صبر کیجئے کہ آپ کے خطوط کا جواب نہیں آئے گا۔

"حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں"

اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے قبلہ ——

اگر تم ہندوستانی فلم ایکٹر ہو اور اسکرین پہ کوئی مرنے کے لئے ایڑیاں رگڑ رہا ہے تو دل کو رونے اور جگر کو پیٹنے کی ضرورت نہیں۔ جب تک اسکرین پہ مرجانے والا عالم نزع میں تڑپ رہا ہو تم ایک ٹیون تیار کر لو اور اس کے مرتے ہی موقعہ کی مناسبت سے گانا شروع کر دو سینما بین مخلوق تمہاری اس لغو حرکت کو بالکل برا نہیں سمجھے گی۔

اگر تم ہندوستانی فلم دیکھنے والی مخلوق میں سے ہو اور تمہاری دل پسند ہیروئن ریل گاڑی کے نیچے کچل جاچکی ہے تب بھی رونے پیٹنے کی ضرورت نہیں ریل گاڑی گزرنے کے بعد وہ آپ کو پٹری کی دوسری طرف پڑی نظر آئیگی۔ اس حادثہ کی وجہ سے وہ اپنا حافظہ یا قوت بینائی یا گویائی کھو بیٹھی ہوگی۔ پھر بھی سوگ منانے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ ساڑھے تین گھنٹے کے فلم کے ختم ہونے سے پہلے پہلے وہ اپنی تمام خوبیاں حاصل کرلے گی سوائے ایکٹنگ کی خوبی کے جس کو حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی جاتی۔

"ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں"

پوچھنا بیکار ہے۔ آپ کا گزر صرف اس لسانی ریاست میں ہو سکتا ہے جسکی زبان آپ جانتے ہوں۔ اگر آپ کوئی بھی ریاستی زبان نہیں جانتے تو آپ کی حالت قابل رحم ہے۔ مناسب ہوگا کہ کوئی ایک زبان سیکھ لیجئے اگر آپ عمر رسیدہ ہیں اور نئی زبان سیکھنے کے موقف میں نہیں تو پھر ہمارا مشورہ ہے کہ آپ ریل گاڑی کا سفر اختیار کریں۔ اگر خدا نے چاہا تو بہت جلد کوئی نہ کوئی ریل گاڑی آپ کو عدم آباد کے اسٹیشن پہنچا دے گی اور آپ زندگی کے تمام دکھ دردوں سے یکسر نجات پا جائیں گے۔

"کوئی کہے کہ شب مہ میں کیا برائی ہے"

اس کا جواب چوروں سے پوچھیے یا پھر ان ملکوں سے جن کے شہروں پہ جنگ کے دوران بم باری کی جاتی تھی

"تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب"

اس لئے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو موصوف ضرور اپنا وعدہ بھول جائیں۔ الیکشن سے پہلے کیے ہوئے وعدے بہت جلد بھول جاتے ہیں بشرطیکہ وعدہ کرنیوالا الیکشن جیت گیا ہو۔

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے؟

اس نے جو آہیں بھرتا ہے یعنی آہوں کی بے اثری۔ آجکل صرف دو چیزیں اثر رکھتی ہیں ایک زر اور دوسرا زور یعنی با اثر لوگوں سے ناطہ۔

"یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے"

شاید اس لئے کہ لوگوں کو میری زبان سمجھ میں نہیں آتی اور ممکن ہے کہ میرے خیالات بھی آزاد ہندوستان کی ترقیوں اور

Socialistic Pattern of Society

کے نصب العین کے مخالف ہوں۔

Socialistic Pattern of Society

سے مراد یہ ہے کہ اگر کم آمدنی والے لوگوں کا معیار زندگی نہ بڑھایا جاسکے تو یکسانیت پیدا کرنے کے لئے اونچی آمدنی والوں کے معیار زندگی کو گھٹا دیا جائے۔

"کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے"

اس لئے کہ کہیں آپ اپنا بوریا بستر باندھ کر ان کے غریب خانے پر پہنچ کر حضرت داغ کی طرح مستقل طور پر نہ بیٹھ جائیں۔ اس گرانی کے زمانے میں بھلا کون عزیز کسی کو جانے گا جبکہ ہر کوئی اپنی جان عزیز کو بچانے کی فکر میں سرگرداں ہے۔

"کرتے ہو مجھ کو منع قدمبوس کس لئے"

خاص اس لئے کہ شکل و صورت سے یتیمی اور حاجتمندی ٹپکتی ہے۔ ایسے لوگوں سے تو ہاتھ ملا کر احتیاطاً انگلیاں گن لینی پڑتی ہیں۔

"شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں"

کپڑوں کو اگلے دن پہننے کے قابل رکھنے کیلئے اسکے علاوہ ممکن ہے یہ واقعہ ہی جون میں ہوا ہو جبکہ گرمی اپنے شباب پر تھی اور بجلی کا کرنٹ اپنے معمول کے مطابق آف ہوگیا ہو۔ یا پھر کسی ڈانس میں شریک ہونیکی غرض سے غیر ضروری لباس اتار دیا گیا ہو۔

"بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں"

غیر تو خیر آپکو کیوں اٹھائیگا لیکن اس کا ضرور احتمال ہے کہ آپ کسی موٹر یا لاری کی زد میں آجائیں۔ اس کے علاوہ اگر شکل و صورت سے آپ کا ستیہ گرہی ہونا ظاہر ہو تو پولیس کا پہرہ آپ کے گرد لگ جائے گا اور شہر کے متعدد بیکار لوگ آپ کے درشن کرتے ہوئے ہی وقت گزاریں گے۔

"موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں"

آزاد ہندوستانیوں کی حد تک سو فیصد صحیح ہے۔ جن کو غم غربت، غم رقیباں، غم بیکاری، غم کثرت اولاد، غم بیماری، غم مہمان نوازی، غم بیکسی، غم وضعداری، غم ناواقفیت زبان سرکاری، غم محرومی، وزارت سے نجات نہیں۔ اور پھر غم عشق تو ہر ہندوستانی کو ورثہ میں ملتا ہے۔

"راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں"

راہ میں راشن کی دوکان کی طرف جاتے ہوئے یا سینما یا بس کے کیو میں ملاقات کیجئے۔

"کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو کہ کیونکر ہو"

خط لکھئے۔ ٹیلی گرام دیجئے۔ ٹیلی فون پر بات کیجئے۔

"نیند کیوں رات بھر نہیں آتی"

گرمی ہوگی۔ مچھر بھیں بھیں کرتے ہوں گے۔ کھٹمل کاٹتے ہوں گے۔ یا پھر دو تین چھوٹے چھوٹے بچے باری باری سے رو رہے ہوں گے کسی کے قرض چکانے کا بار دل پر ہوگا۔ ٹیکس ادا کرنے کی تاریخ سر پر آگئی ہوگی۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ گھر کی اس تاریخی کھاٹ میں الجھے ہوئے پڑے ہوں جو پشت در پشت مختلف پشتوں کی پشت پناہی کرتے کرتے خود اپنی پشت کھو بیٹھی ہو اور جس کے انجر پنجر ایسے ڈھیلے ہوگئے ہوں کہ جس میں پڑ جانے کے بعد آپ ایسی کیفیت میں پہنچ گئے ہوں کہ گھٹنے آگے بڑھ کر آپ کی پیشانی کی بلائیں لینے لگے ہوں اور آپ کو اپنا جسم دو حصوں میں برابر تہہ ہوتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔

"تمھاری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے"

مہینہ کی دوسری تاریخ سے نہ صرف جیب کو رفو کی حاجت نہیں رہتی بلکہ اگر جیب نہ بھی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

"کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے"

جہاں بات بنائے نہ بنے وہاں بات بن سکتی ہے۔ اگر کچھ خرچ کیا جائے مثلاً ریل کے سفر کے لئے جگہ ملازمت میں ترقی اور بقول دلاور فگار۔

"لے کے رشوت پھنس گیا ہے دیکے رشوت چھوٹ جا"

"آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے"

اگر آپ موٹر پر سوار ہیں تو پھر سائیکل سوار، راہرو کتے، گدھے، بکریاں، گائے، بھینس سبھی سامنے آئیں گے۔ اس لئے اپنی گاڑی کے بریک اچھی حالت میں رکھئے اور نظر کو تیز۔

اگر آپ کسی محکمہ میں ملازم ہیں تو ہر قسم کے کام آپ کے سامنے تکمیل کے لئے آئیں گے اور اگر آپ اپنے فرائض کی انجام دہی میں محنتی ایمانداری اور محنت کا استعمال کرتے ہیں تو پھر جب ترقی کا موقعہ آئیگا تو یقیناً کوئی اور آپ کے سامنے آجائے گا۔ کوئی ماہر پیروی کسی کا سالا یا کسی ذی اثر انسان کا رشتہ دار!

اگر آپ دلی کے کسی فیشن ایبل ریسٹوران میں جا بیٹھیں تو

(باقی صفحہ ۸۱ پر پڑھئے)

بھارت چند کھنہ

جوابِ شکوہ

دلّی میں جشنِ غالب جو حال میں ہوا تھا
شکوہ مرا وہاں پر ساحرؔ سا خوشنوا تھا
اس کی سمجھ میں آیا ہرگز نہ یہ معمّا
اُردو گو گاڑ کر یہ غالب کا جشن کیسا
رہ رہ کے میں نے سوچا، اس کا جواب کیا ہے
ساحرؔ کے دل میں آخر یہ پیچ و تاب کیا ہے
کل رات اپنے بستر میں جب پڑا ہوا تھا
فکرِ رسا نے میری حل یہ کیا معمّا
یہ جشنِ پُرعقیدت سازش نہیں ہے ساحرؔ
یہ جوشِ مہر و الفت سازش نہیں ہے ساحرؔ
اکیس برس پہلے جو کچھ کہ ملا ہم کو
تھی جنسِ گراں مایہ، جوہر سے مگر عاری
لوگوں کے دلوں میں تھا اک جذبۂ خودداری
احساسِ خود آرائی عنوانِ شکیبائی
اکیس برس کے اب جو ہند میں بالغ ہیں
پیدا وہ ہوئے تھے سب آزادی کے پالنے پر
آزادی میں پل کر یہ آزاد ہوئے ہیں سب
جو کچھ بھی ہوا اب تک وہ خوابِ تمنا تھا
رستے پہ چلو گر تم اور آنکھ کھلی رکھو
آزادی کے دیکھوگے ہر گام پہ نظارے

اکیس برس پہلے اسکولوں کے سب لڑکے
پڑھتے تھے جماعت میں ڈرتے تھے معلّم سے
حالت ہے یہ اب یارو اسکول کے لڑکوں کی
تھامے ہوئے پتھر کو آتے ہیں وہ لڑ لڑ کے
پڑھنے کی غرض سے وہ جاتے نہیں مکتب میں
جاتے ہیں وہ ہاتھوں میں چمکاتے ہوئے چاقو
اور ملک کے لیڈر بھی کچھ کم نہیں بچّوں سے
ہر فعل نمونہ ہے بچکانہ طبیعت کا
چوپائیوں کو بھی حاصل آزادی کی یہ لت ہے
پھرتے ہیں سڑک پر وہ آزادی کا مل سے
ہر شخص کو ہے حاصل آزادی ہی آزادی
گر چاہے بنے قاتل یا کرے نئی شادی
ہم لوگ حقیقت میں آزاد ہوئے ہیں اب
ہے وقت یہی موزوں منوانے کا مانگیں سب
مقصود ہے گر ہم کو اردو کے لیے اک گھر
اعلان ارادے کا کر دیجئے فر، فر، فر

rekhta

اپنے اس ارادے کو کرنا ہو اگر پورا

شعلوں کو ہوا دیجئے نیتاؤں کے دامن سے

آغاز میں گو ہو گی اک چھوٹی سی چنگاری

بن جائے گی بالآخر یہ برقِ تپاں یکسر

اک نکتہ ہے البتہ بھولو نہ اسے ہرگز

عنوان درخشاں ہو مضمون پریشاں ہو

تجویز ہو کچھ ایسی جس کا نہ ہو کچھ مطلب

تشکیل کے ناقابل آئے وہ نظر سب کو

مل کر کے سبھی چیخیں یہ اردو کے دیوانے

اُردو کا وطن اپنا لازم ہے کہ دلّی ہو

دلّی میں بسیں بس وہ جو جانتے اردو ہوں

ٹکسالی زباں بولیں، ہوں اہلِ زباں پیارے

اس وقت بشر لاکھوں رہتے ہیں جو دلّی میں

تامل ہوں یا گجراتی، چینی ہوں یا جاپانی

اُن پہ یہ پڑھو فتوے دلّی سے وہ اُٹھ جائیں

گھل مل کے رہیں یکجا، اپنی ہی ریاست میں

ہوں شہر میں غالب کے اردو ہی کے دیوانے

اُردوِ معلّے کے لبریز ہوں پیمانے

بن سکتی ہے دلّی بھی پھر اردو کا گہوارا

گاتا پھرے اردو کے ہی گیت جو بنجارا

تحریک ہے یہ مہمل، انکار نہیں اس سے

منظور نہیں ہو گی، ظاہر ہی ہوتا ہے

مجھ کو ہے یقیں لیکن آزادی کے صدقے میں

پھولے گی پھلے گی یہ جیسے کہ کوئی لیڈر

ہو سکتا ہے پھر ساحر دلی کو چلے آئیں

شیو سینا کا گھر چھوڑیں بمبئی سے منہ موڑیں

لودھیوں کی بستی سے جو ناطہ ہے وہ توڑیں

ممکن ہے کہ تب ساحر کچھ چین و سکوں پائیں

غالب مکتب میں

رشید قریشی

درس و تدریس انسانیت کی ایک مقدس خدمت ہے۔ صاحب علم اپنے علم کی جوت سے اندھے چراغوں کو روشن کرتا جاتا ہے اسی لئے استاد کی فضیلت اور بزرگی کے قدموں میں احسان مندانہ احترام کی گردن جھکی رہتی ہے لیکن جب سے علم رسانی کو پیشہ بنالیا گیا اور استاد کو شاگردوں کی تعلیم سے زیادہ اپنی تنخواہ کی فکر رہنے لگی اس فن کے تقدس پر کاروباریت کی مکروہ دھند چھانے لگی۔ کبھی علم دوست اور علم نواز مدرسہ کی طرف گئے لیکن مدرسہ کی ناسازگار فضاؤں نے ان کو ترپ کناں باہر ڈھکیل دیا غالب بھی بچوں کو پڑھانے کی نوکری کے امیدوار ہے۔ کہنے کو تو وہ کہتے تھے۔ سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری۔ کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے۔ لیکن سپہ گری ان کے کچھ کام نہ آئی اور نہ ہی ان کی علمی فضیلت ان کو کام کا آدمی بنا سکی۔

مولانا آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں سنہ ۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انگلشیہ کو دہلی کالج کا انتظام از سر نو منظور ہوا۔ ٹامسن صاحب جو کئی سال تک اضلاع شمال و مغرب کے لفٹنٹ گورنر بھی رہے اس وقت سکریٹری تھے وہ مدرسین کے امتحان کے لئے دلی آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپے مہینے کا ایک مدرس عربی ہے ایسا ہی ایک فارسی کا بھی ہو۔ لوگوں نے چند کاملوں کے نام بتائے ان میں مرزا کا نام بھی آیا۔ مرزا صاحب حسب الطلب تشریف لائے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی مگر یہ پالکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھیرے کہ حسب دستور قدیم صاحب سکریٹری استقبال کو تشریف لائیں گے۔ جبکہ نہ وہ ادھر سے آئے نہ یہ ادھر سے گئے اور دیر ہوئی تو صاحب سکریٹری نے جمعدار صاحب سے پوچھا پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں چلتے۔ انہوں نے کہا کہ صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے میں کیونکر جاتا۔ جمعدار نے جاکر پھر عرض کیا صاحب باہر آئے اور کہا جب آپ دربار گورنری میں بحیثیت ریاست تشریف لائیں گے تو آپکی وہ تعظیم ہوگی لیکن اس وقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں اس تعظیم کے مستحق نہیں۔ مرزا صاحب

نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی ملازمت باعث زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں نہ یہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں۔ صاحب نے فرمایا کہ ہم آئین سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب رخصت ہو کر چلے آئے۔ یہ تو دہلی کالج کی نوکری کا قصہ ہوا' ان کا ایک خط جو کہیں چھپا نہیں اور ڈاک میں جانے سے پہلے پہنچتے پہنچتے مجھ تک پہنچا اس میں ان کے تدریسی تجربے کی داستان ملتی ہے۔

کون ہو۔ دستک کہہ رہی ہے میر مہدی مجروح ہو۔ واپس چلے جاؤ میر مہدی مجروح۔ مجھ سے ملنے پر اصرار نہ کرو۔ دروازہ نہ کھولنے کی تاکید میں کلیان کو کر چکا ہوں۔ سبب اس معذوری کا یہ ہے کہ وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں۔ اب تو ایک اسکول کا مولوی ہوں اور اپنی بپتا تمہیں لکھ بھیج رہا ہوں۔ اس خط کو وصول کر لینا پڑھ لینا۔ تب آنا۔ صاحب سکریٹری سے میرا جو معاملہ رہا وہ میں تمہیں لکھ چکا۔ اب سنو کہ وہاں سے گھر لوٹا تو بیگم کو دروازہ ہی پر استقبال کے لئے کھڑا پایا۔ جن کو استقبال کے لیے آنا تھا وہ نہ آئے اور جن کا سامنا کرتے دل لرزتا تھا وہ چشم براہ۔ یہ ہے غالب کی تقدیر۔ غالب کیوں مغلوب کی تقدیر کہو۔ ادھر صاحب سکریٹری نے دھتکار دیا ادھر بیگم کے غلبہ نے دبا لیا۔ بہت گرجیں۔ بہت چمکیں۔ جان غالب کو دعائیں دو کچھ بھی نہ ہوا۔ سنو بھائی تم بھی۔ میں نکھٹو۔ مکھیاں مار وہ شاگردوں کی واہ واہ پر اینٹھو۔ تمہارا زمانے کا گھر والا بنا پھرتا ہوں اور گھر چلاتے ہیں۔ میرے شاگرد۔ شاعر نہیں فقیر ہوں کہ خیرات پر جیتا ہوں۔ پوچھو تم کیوں جیتے ہو غالب۔ اور میں کہوں کوئی دن گر زندگانی اور ہے۔ اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے۔ اور کیا ٹھانی ہے، یہی ٹھانی ہے کہ نوکری کریں گے اور وہ بھی بچوں کو پڑھانے کی۔ وہ جو اپنے محلہ کی مسجد کے پیش امام ہیں نا۔ انہوں نے ایک چھوٹا سا مدرسہ کھول رکھا ہے۔ ان کو بہت دنوں سے اصرار تھا کہ ہم ان کے مدرسہ میں پڑھانے کو آیا کریں۔ غالب کو تم جانتے ہو کہ مکتب عشق کا قدیم درس یاب ہے ان پیش اماموں کے پیچھے کہاں سر کھپانے والا۔ لیکن زمانے کے ہاتھوں پیش امام کے مکتب میں گلستان، بوستان پڑھانے چلا ہے کسی نے سعدی صاحب سے کہا تھا کہ آپ کے اشعار مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں تو وہ بیچارے سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ ہے ہے میرے کلام کو مدرسہ میں کون ظالم لے گیا۔ یہ اس دور کا سانحہ ہے کہ خود شاعر کو مدرسہ میں جھونکا گیا تو میاں مہدی یہ داستان مختصر یوں ہوتی ہے کہ آنکھیں بند کرو اور دیکھو کہ غالب خستہ ایک اونچی جگہ براجمان ہے سامنے کوئی ۱۲۔۱۰ بچے بیٹھے ہیں۔ کوئی کسی کھیت کی مولی۔ کوئی کسی کھیت کا گاجر۔ اور کوئی کسی چمن کا پھول۔ لیکن اس قدر اداس اور پژمردہ صورتیں لئے ہوئے کہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ نقش فریادی ہو کس کی شوخیٔ تحریر کے ؟ خود اپنا وہ زمانہ یاد آ رہا ہے جو اس شعر میں مجسم کر رہ گیا ہے۔

لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز
یعنی یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

یہ بچوں کو پڑھانا بھی کیا آرام کا کام ہے۔ سب بچے جب ایک آواز ہو کر سبق کی گردان کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کئی ساز ہم آہنگ ہیں۔ مجھ پر ایک غنودگی سی طاری تھی کہ ایک برخوردار اپنی جگہ سے اٹھے، اپنی انگلی مجھ پر بھونک ماری اور باہر چلے گئے۔ دوسرے صاحبزادے نے دو انگلیاں مجھ پر پھیریں اور وہ بھی داغ مفارقت

دیے گئے۔ تیسرے صاحب اٹھے انہوں نے پورا پنجہ میری آنکھوں کے سامنے سانپ کے پھن کی طرح لہرادیا۔ اور ایکدم ایسی آواز آنے لگی۔ جیسے زمین گھومتے گھومتے کہیں رگڑ کھا رہی ہو۔ مُڑ کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ سب بچے اپنی تختیاں زمین پر دھپ دھپا رہے ہیں۔ یہ شاید استاد کے لئے دوامی ترانہ تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا اور شفقت کے لہجے میں کہا۔ بچو۔ آج ہم انسانیت کے سبق سے اپنا درس شروع کرتے ہیں۔ نہ سنو گر برا کہے کوئی۔

میں دوسرا مصرع شروع کرنے ہی کو تھا کہ کونہ کا ایک بچہ اٹھا۔ مولوی صاحب اس شعر کا مطلب کیا ہے میں سادہ دل آزردگی یار سے خوش ہوں یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا۔ صاحبزادہ کی عمر بمشکل دس برس کی ہوگی اور وہ جاننا چاہ رہے تھے کہ سبق شوق مکرر کیوں نہیں ہوا۔ میں نے سنی ان سنی کردی تو دوسرے صاحب ایستادہ ہوئے۔ حضرت۔ اس شعر میں لام الف لیلا کے لئے ہے یا شاعر کا تخلص ہے

تھا تعلیم درس بے خودی کبھی اس زمانے سے۔ کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا۔ دیوار دبستان پر

میں کچھ کہنے ہی کو تھا کہ ایک شوخ کہہ اٹھا۔

ہمارے مدرسہ کی دیوار پر بھی ایسا ہی کچھ لکھا نظر آتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب ہمیں معلوم ہے۔

میں نے چھڑی ہوا میں گھمائی اور ذرا سخت لہجہ میں للکارا۔ بچو یہ تمہارا مدرسہ ادبستان ہے۔ یہاں جو کچھ تمہیں سکھایا جائے وہی سیکھو۔ تم جو سیکھنا چاہتے ہو یہاں نہیں سکھایا جائے گا۔ اور نہ تم کو کہیں اور یہ باتیں سیکھنی چاہئیں۔ میری آواز ڈھول دھپے کے غل میں دب کر رہ گئی۔ میر مہدی بچوں کو پڑھاتا شیطانوں کو راہ راست پر لاتا ہے۔ سو جو تو بھی میں ان کی تفہیم کر رہا ہوں اور وہ ایک دوسرے کو کانٹوں سے کچوکے دے رہے ہیں۔ اتنے میں وہ تین بچے جو باہر گئے ہوئے تھے اندر آگئے اور ان میں کا ایک بچہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ میں نے وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ پیش امام صاحب وضو کرتے کرتے حوض میں پھسل کر گر پڑے اور اب ان کا کہیں پتہ نہیں۔ اس خبر کے سنتے ہی سارے بچے اچھلنے کودنے اور چھٹی کا تقاضہ کرنے لگے۔ میں نے ان کو گھر جانے کی اجازت دیدی اور آنکھیں بند کئے اپنی جگہ بیٹھا دل کو سمجھاتا رہا۔

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

اور

ہے سنگ پر برات معاش جنون عشق
یعنی ہنوز منت طفلاں اٹھائیے

کہ اس طرح چونک پڑا جیسے کسی دہشتناک درندہ کے قرب کی مجھے خبر ہوگئی ہو۔ سامنے پیش امام صاحب بہ نفس نفیس قیام فرما تھے۔ انہوں نے پوچھا مولوی صاحب بچوں کو کیوں چھوڑ دیا آپ نے، میں کچھ کہنے ہی کو تھا کہ انہوں نے دوسرا وار کیا۔ اس طرح اگر آپ بچوں سے اپنے گھر کا کام لیں گے تو پھر ہو چکی آپ سے نوکری۔ میں

پریشان کہ یا اللہ میرے ویران گھر میں کام ہی کیا دھرا ہے۔ جو میں بچوں کو استعمال کروں گا۔ میں صرف اتنا پوچھ سکا۔ حضرت یہ آپ سے کس نے کہا۔ بچے تو آپ کے بارے میں .... خدانخواستہ بپھر گئے۔ کہنے لگے اس محلے کے بچے جہنمی ہیں ان کو سر چڑھالیں گے تو سارے شہر پر عذاب نازل ہوگا۔ بچوں نے مجھ سے کہا آپ نے ان کو گھر کے کام کاج کے لیے بھیجا ہے۔ اور ایک کو تو شائد آپ نے ، استغفراللہ۔ اے عذاب نازل کرنے والے معبود میں نے کسی بچے کو استغفراللہ کے لیے نہیں بھیجا۔ جناب پیش امام صاحب یہ استغفراللہ کیا بات ہوئی کہنے لگے۔ حضرت آپ نے اس کے ہاتھ سے بوتل منگوائی۔ غضب کر دیا۔ میں نے توبہ کی۔ کانوں پر ہاتھ دھرے۔ لیکن وہ نہ مانے۔ میر مہدی تم گواہ رہیو میں بچوں کی شر انگیزی پر ایمان لاتا ہوں۔ میں نے گھر سے تپ محرقہ کے لیے دوا منگوائی اور پیش امام صاحب بوتل میں اتر گئے تو میر مہدی یہ ہے ہمارا احوال۔ گھر پہنچتے ہیں تو بیگم پوچھتی ہیں تنخواہ لائے۔ غور تو کرو یہ عورتیں کس قدر مطلب پرست ہوتی ہیں۔ مدرسہ میں جو کچھ مجھ پر گذری اس کی پرسش نہیں۔ سوال یہ کہ تنخواہ لائے یا نہیں۔ اس خدا کی بندی اور میری بیوی کو کون سمجھائے کہ تنخواہ روز روز نہیں ملتی ہے اس کے لیے تو مہینہ بھر کھپنا پڑتا ہے کہ اس بچاری کا بھی قصور نہیں۔ گھر کی جو بے سروسامانی ہے وہ تم سے پوشیدہ نہیں۔ اور خدا گواہ ہے کہ پریشان حالی میری پیدا کردہ نہیں مشیت نے چاہا کہ میں یوں ہی ننگا بھوکا مروں۔ ہائے ہائے ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا لگتی کہتے تو تنخواہ کے لیے روز روز کی حاضری لگ گئی بچے پڑھنے سے زیادہ مجھے پڑھاتے رہے اور میں زچ ہو ہو کر بھی نوکری نباہتا رہا۔ حق یہ ہے کہ نئی نسل پڑھنے والی نہیں کھلنڈری ہے اور استاد کو بھی کھلونا سمجھتی ہے۔ ادھر ان کی کور مغزی کا یہ حال اور ادھر ان کے والدین کی خوش فہمی کا یہ عالم کہ چاہتے ہیں ان کا بچہ ایک ہی دن میں غالب کا بھی استاد بن جائے۔ میر مہدی سچ کہتا ہوں میرے اندر جو بھی فیضان اور وجدان ہے وہ میرے اندر سماتا نہیں۔ میں چاہتا ہوں اس آفتاب کو کرن کرن دوسروں کے دلوں میں اتار دوں لیکن ایسا جوہر قابل مدرسہ کی چار دیواری میں مجھے نظر نہیں آتا۔ یہاں تو وہ ناپسندیدہ مخلوق ہے جن سے ان کے گھروں کی چھتیں اور آنگن بیزار ہیں۔ چند دن اور ان کے ساتھ رہوں تو دیوانہ ہو جاؤں۔ آج مکتب کی دیوار پر ہم نے کوئلہ سے نقش کی ہوئی اپنی تصویر دیکھی۔ کسی منچلے نے ایک بوتل کو دو لکیروں پر لٹکا دیا۔ دیکھا کمال مصوری ! طیش میں آکر میں نے سارے بچوں کو پیٹ ڈالا۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ میرے پاپوش غائب اور دوپہر کے قیلولہ کے بعد آنکھ جو کھلتی ہے تو کلاہ ندارد۔ میں سیدھا پیش امام صاحب کے پاس گیا وہاں مسجد کی سیڑھیوں کے پاس ہی مجھ سے اصلاح لینے والا اصلاح ساز مل گیا۔ وہ اپنے دامن میں ایک پر پوش کو چھپا لایا تھا میں نے وہیں وہ بوتل خالی کر دی اور پیش امام صاحب کی راہ تکنے لگا۔ میر مہدی تم ہماری اس ملاقات کا منظر دیکھنے وہاں موجود ہوتے میں پیش امام کا دامن گیر نہ مجھ سے گریزاں۔ خیر گزری کہ مجمع نہیں لگ گیا۔ سمجھو یہی بارہ تیرہ میری تنخواہ تھی بس اسی ملاقات میں پڑھانے سے استعفیٰ دیا۔ اب گھر بیٹھ گیا ہوں۔ اصلاح ساز مفت میری اصلاح کر جاتا ہے میں مفت اسکی غزلوں میں اصلاح دیدیتا ہوں۔ چلو مدرسہ نہ سہی یہ دنیا سہی۔ بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے۔ تم گئے نہیں۔ ڈھیٹ ہو میرے شاگرد رشید میر مہدی مجروح آجاؤ۔ اندر آجاؤ۔ تو دیکھ لو انگلیاں فگار خامہ خونچکاں !

مرنا چاہے ہوں میں مگر ہمدم — کوئی صورت نظر نہیں آتی
آنکھ جھپکی نہیں تھی جب دن بھر — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے یوں ہی ہمی یاد آتی تھی — اب کسی بات پر نہیں آتی
ڈھیر ساری ہیں نعمتیں موجود — پہ طبیعت اُدھر نہیں آتی
روڈ پر وہ ملے تھے، میں چپ تھا — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
وہ قریب آتے اور سُن لیتے — میری آواز گر نہیں آتی
بے بُلائے ہی آد ھمکتے ہو — شرم تم کو مگر نہیں آتی

کل نکالے گئے پھر آج آئے
شرم تم کو مگر نہیں آتی

تضمینِ غالب

محمد منظور احمد

کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں؟

راہ میں اِک بیل تھا
بیٹھا ہوا تھا راہ پر
میں نے کہا کہ اے حضت!
عیش کی یہ جگہ نہیں
کہنے لگا کہ جی نہیں
یعنی کہ ہاں، نہیں نہیں
دیر نہیں حرم نہیں
در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم
کوئی ہمیں اٹھائے کیوں؟

نا معلوم

ع — اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

ع — شکیبِ صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

غالب کو گزر کر یعنی وفات پا کر آج ایک سو سال ہو گئے۔ لیکن غالب ابھی پوری طرح گزرے نہیں ہیں۔ اسی لیے انھوں نے کہا تھا کہ
"مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا —" اچھا ہوا کہ غالب دہلی میں رہا کرتے تھے۔ اگر وہ الٰہ آباد یا بمبئی میں رہتے ہوتے تو ان کی
غرقِ دریا ہونے کی خواہش بہ آسانی پوری ہو جاتی اور وہ اس طرح رسوا نہ ہوئے ہوتے۔ اگر وہ اس طرح رسوا نہ ہوئے ہوتے
تو ہم لوگ کس طرح اتنے خوش ہوتے — اور کون تھا جس کی رسوائی انٹرنیشنل رسوائی ہوتی؟ — غالب آج پھر زندہ
ہوئے ہیں اور کم از کم ایک سال اور زندہ رہیں گے —

غالب کے حالاتِ زندگی میں ان کی وفات کے بعد بڑی تیزی سے تبدیلیاں ہوئیں بلکہ ان
ں ایک انقلاب سا آ گیا۔ اور ان کے حالاتِ زندگی اب اتنے بدل گئے ہیں کہ معلوم نہیں
ہوتا کہ یہ انھیں کے حالاتِ زندگی ہیں یا کسی اور کے۔ اسی لیے اقبال نے کہا تھا

ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں

خود غالب کو اپنے کلام سے اپنی زندگی میں اتنی
شہرت نہیں ملی جتنی ان کی وفات کے بعد ان
کا کلام نہ سمجھنے والوں کو ملی — اللہ
کا دین ہے — ہندوستان

مفشا ناظم — غالب وہ شخص کہ سب اچھا کہیں جسے

ں ہر سال غالب کے
ں بارہ اسپیشلسٹ نمبر پیدا ہو جاتے
۱۹۶۸ اور ۱۹۶۹ء تو خاص طور پر ان اسپیشلسٹوں
کی پیدائش کے لیے مقرر ہے — بمپر کراپ کے معنی
سمجھ میں آئے ہیں۔ اس میدان میں کوئی فیملی پلاننگ نہیں۔

ہندوستان میں سرجری کا آغاز اصل میں غالب سے ہوا۔ عام طور پر
شاعروں کا کلام پڑھنے یا سننے کے لیے ہوتا ہے — (اب جو کلام رونما ہو رہا ہے وہ
صرف گانے کے لیے ہوا کرتا ہے) — لیکن غالب کا کلام ڈی سیکٹنگ کے لیے استعمال
ہوتا ہے۔ کئی لوگ جنھیں کرنے کے لیے اور کوئی کام نہ تھا عمر بھر غالب کے کلام کی شرح کرتے رہے۔
ان کے اشعار کا وہ مطلب نکالا جو ان میں نہیں تھا — یہ بھی بڑا کارنامہ ہے — یاروں گھٹنا پھوٹے آنکھ
بھی کہتے ہیں۔

غالب اگر شاعر نہ ہوتے تو یقیناً محکمۂ قانون یا محکمۂ فینانس میں ملازم ہوتے اور ان کا تصنیف کیا ہوا قاعدہ یا قانون اتنا ہی پیچیدہ
ہوتا کہ ملک و قوم کے لیے منزوری ہے — غالب پیچیدگی کے ماہر تھے اور اخیر اخیر میں تو انھیں پیچیدگی سے عشق ہو گیا تھا۔ خواہ مخواہ غیر معمولی

پے چیدہ شعر کہتے۔ لوگوں کو سنا کر جی ہی جی میں خوش ہوتے اور بعد میں شیفتہ کو ہدایت کر دیتے دیکھو! یہ شعر میرے دیوان میں نہ رکھنا —— لیکن شیفتہ کہاں تک یاد رکھتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج بھی دیوانِ غالب میں کئی ایسے اشعار موجود ہیں جو غالب نے صرف لوگوں کو سنانے کے لیے کہے تھے —— غالب کے اسپیشلسٹوں میں ان اشعار پر ہمیشہ فساد ہوا کرتا ہے (لیکن کوئی شہید نہیں ہوتا) ——
غالب کے سے پے چیدہ اور مشکل اشعار کہنا پھر کسی اور شاعر کو نہیں آیا —— وہ ملک الشعراء تھے اور مشکل الشارحین —— اور کمال یہ ہے کہ غالب نے یہ تمام مشکل اشعار لیٹے لیٹے کہے —— شعر ہمیشہ وہ لیٹ کر ہی کہا کرتے تھے۔ خط البتہ وہ اکڑوں بیٹھ کر لکھا کرتے تھے —— لیٹ کر شعر کہنے اور اکڑوں بیٹھ کر خط لکھنے کا یہ انداز پھر کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔
اکڑوں بیٹھنا دراصل غالب پر ختم ہوگیا۔ اب جو ادیب، شاعر ایسا کرتے ہیں، اپنا وقت ضایع کرتے ہیں انھیں حاصل کچھ نہیں ہوتا کیونکہ جتنی بھی شہرت تھی، غالب کے حصہ میں چلی گئی۔

غالب کے بارے میں نئی تحقیق یہ ہوی ہے کہ وہ ہندوی کے شاعر تھے۔ دو چار سال اور گزر جانے دیجئے غالب سنسکرت کے شاعر بن جائیں گے —— اگر یہی حالات برقرار رہے اور لوگوں کی سوجھ بوجھ میں مزید اضافہ ہوا تو غالب کے حالاتِ زندگی میں یہ تبدیلی بھی برپا ہو کر رہے گی۔
غالب کے کئی مشغلے تھے جن میں سب سے مشہور مشغلہ تصوّرِ جاناں تھا۔ غالب جوانی کے زمانے میں بہت تصوّرِ جاناں کرتے تھے اور دن بھر یوں ہی بیٹھے رہتے تھے۔ بعد میں اُن پر کام کا بوجھ بہت ہوگیا اور انھیں مطلق فرصت نہیں ملنے لگی، اس کا انھیں بے حد صدمہ تھا اور وہ کہا کرتے تھے ؎

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوے

غالب کے دوسرے مشغلوں میں ان کا مشہور مشغلہ رونا تھا وہ بسیار روتے تھے۔ یہ کام انہوں نے غدر کے بعد شروع کیا تھا۔ غدر کے ب[illegible] ہندوستان میں سوائے رونے کے [illegible] اور کسی بات کا موقع بھی کیا تھا۔ غالب اپ[illegible] رونے سے ڈرتے بھی تھے اور کہتے تھے ؎

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

غالب کا تیسرا مشہور مشغلہ سفر کرنا تھا۔ سفر کر کے [illegible] بہت مسرور ہوا کرتے تھے ؎

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

انھیں سفر کا اتنا شوق تھا کہ وہ کہیں بھی نکل جاتے اور ہر کسی راہ رو کے ساتھ [illegible] تھوڑی دور ہمزدر چلتے —— راہ برکو پہچاننا ان کے بس کا کام نہیں تھا —— راہ برکو اب [illegible] بھی کون پہچانتا ہے؟ ——
غالب نے اتنا سفر کیا کہ ایک مرتبہ تو خضر سے ان کی ملاقات ہوگئی، لیکن غالب نے [illegible] اُن کی پیروی کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی سفر کے شوق نے انھیں بیاباں پہنچا دیا اور [illegible] وہاں انھیں معلوم ہوا کہ اُن کے گھر میں بہار آئی ہے۔
غالب پتہ نہیں اب کہاں ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُن کے گھر میں اب بہار آئی [illegible] ہے۔

●●

"اردو شعر و ادب ہی میں نہیں بلکہ طنز و ظرافت کی محفل میں بھی غالب اسی طرح داخل ہوتے ہیں جیسے فلمی گانوں کے درمیان پکے گانے والے کا کوئی استاد وارد ہو جائے"

●

پروفیسر رشید احمد صدیقی

کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی ہوا
W.H.
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
W.H.

GAMBLERS — قمار باز

NOTICE BOA

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے بایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

— W.H. —

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جسکی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

W.H.

زینت ساجدہ

ذکر تیرا تجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

سنیے تو!

اے جناب نجم الدولہ دبیر الملک۔ اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ متوطن آگرہ، ساکن دہلی، حال خدا معلوم۔ اللہ اللہ اب یہ نوبت آگئی کہ ہم کھڑے آواز دے رہے ہیں۔ آپ کے نام کی مالا جپ رہے ہیں اور آپ ہیں کہ مارے غرور کے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ چاہنے والوں کے ساتھ آپ کو یہ سلوک زیبا نہیں دیتا اور پھر فرق کیجیے مگر آج کل تو آپ پر نشہ کا عالم ہوگا فرق کرے آپ کی بلا۔

سچ ہے دن بدلتے دیر نہیں لگتی۔ دنوں کی پھیر میں آدمی بھی بدل جایا کرتے ہیں۔ ایک دن ایسا بھی تھا کہ کوئی سخن فہم آپ کو مل جاتا تو آپ کو انوکھی نعمت مل جاتی۔ سخنور عام ہیں سخن فہم نہیں۔ والی بات آپ بار بار کہتے رہے مگر ان دنوں آپ کا بازار مندا تھا۔ اس لیے کبھی کوئی مل گیا تو آپ نے غنیمت سمجھا۔

یاد کیجیے آپ کا حال تو یہ تھا کہ آپ رگوں میں دوڑنے والے لہو کو آنکھ سے ٹپکاتے۔ کبھی ریختہ کو چمکاتے اور کبھی فارسی کلام کے گن گا گا کر خریداروں کو متوجہ کرتے مگر سنتا کون تھا؟ ایک بے چارا جہانگیر آباد کا نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اپنی گلشن بے خار طبیعت سے مجبور تمہاری دلداری کرتا یا پھر تمہارا شاگرد رشید پانی پت کا [illegible] سی الطاف حسین حالی کہ آپ کے عیب کو بھی ہنر جانتا تھا۔ اور سب لوگ تو آپ کا کلام سن کر ناک بھوں چڑھاتے۔ محفل میں اخلاطے کرتے۔ اشعار میں چوٹ چلتے۔ سچی بات تو یہ ہے جو زبان آپ لکھتے تھے وہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کبھی کسی نے کاہے کو بولی ہوگی اور دلی کے گلی کوچوں میں کسی نے کاہے کو سنی ہوگی۔ انوکھا پنے کا تو آپ میں شوق کچھ حد سے سوا تھا۔ کلام پر توجہ نہیں کی کسی نے تو آپ نے شخصیت کا بہروپ بھرا۔ کبھی کلاہ پاپاخ پہنی۔ کبھی داڑھی رکھ لی تو سر گھٹا ڈالا۔ لاکھ آپ نے اپنی وضع قطع سے رعب جمانے کی کوشش کی۔ مگر ہوا کیا۔ کس نے قدر کی آپ کی؟ ساری عمر روتے بسورتے ہی رہے۔ زمانہ کی ناقدری کا رونا رویا کیے۔

ویسے تم ہنسنے کا ڈھنگ رچاتے۔ پتھر کھا کر لڑکوں کو للکارتے مگر تم تھے بڑے رونے والے۔ ہر خط میں اپنی پنشن کا رونا روتے رہے۔ اگر یہ مرضع نہ ہوا تو اسی بات پر

رو لئے کہ ہائے ہم مر گئے تو کوئی رونے والا نہ ہوگا۔ کوئی کیا کرے تم قسمت ہی ایسی لے کر پیدا ہوئے تھے۔ جس دربار کو تاکا تباہ کر دیا۔ جس کا قصیدہ لکھا وہ چوپٹ ہوا جس کی مدح کی وہ پھانسی پر چڑھا۔

ویسے آپ بنتے تو بڑے نازک مزاج خوددار، آزاد اور بے باک تھے مگر دل میں یہ آرزو ہمیشہ بسی رہی کہ کب دربار میں بلائے جائیں کب شہ کے مصاحب بنیں اور اتراتے پھریں۔ دربار میں رسائی ہوئی ضرور مگر کب؟ جب بادشاہ سلامت خود شاہ شطرنج بنے بیٹھے تھے۔ قلعہ سے چل چلاؤ کی تیاری کر چکے تھے۔ آج گئے اور کل گئے۔ آپ جیسے سبز قدم اپنے طالع منحوس لے کر جہاں جائیں یہی کچھ ہوگا۔

آپ کو اپنے پر سو طرح کے ناز تھے۔ کبھی چمپئی رنگت کا ذکر ہے، کبھی قامت کشیدہ کا۔ کبھی اپنے افراسیابی ایماقی تورانی ہونے کا۔ اور شاعری کے بارے میں تو یہ ناز فخر سے بڑھ کر بیماری بن چکا تھا۔ اس زمانے میں نفسیاتی معالج تو تھے نہیں اس لئے خیر گذری ورنہ نفسیات داں وہ بال کی کھال نکالتے کہ تم اترانا اکڑنا سب بھول جاتے۔ جس کلام پر اس قدر ناز فرمایا کرتے تھے اس کی کبھی داد بھی ملی؟ خدا جانے سچ کہتے تھے یا جھوٹ کہ روح القدس نے داد دی۔

بالفرض اس نے داد دی بھی تو کیا۔ وہ کوئی اہل زبان ہے کہ اس کی بات سند بن جاتی! اتنا تو آپ میں کس بل نہ تھا کہ استاد ذوق سے ہی بیت بازی کر لیتے۔ ہمسری کی دھن میں لے کے گئے، تو تھے جواں بخت کا سہرا لکھ کر۔ پھر کیا ہوا۔ استاد نے وہ آڑے ہاتھوں لیا کہ معذرت کرتے ہی بنی۔

آپ عجیب شاعر ہیں۔ سبحان اللہ۔ جو شاعر ہوتا ہے۔ وہ بس شاعر ہوتا ہے اس کے علاوہ اسے پڑھنے لکھنے، بحث مباحثہ کرنے، فلسفہ میں دماغ کھپانے، زخمی دلوں پر مرہم رکھنے کی فرصت کہاں ہوتی ہے۔ وہ تو بس دن رات شاعری کرتا ہے۔ اور کچھ نہیں۔ مگر آپ کو دیکھئے۔ آدمی تھے کہ چوں چوں کا مربّہ۔ عہدہ آپ کا مغلوں کی تاریخ نویسی، مشغلہ اس کے بعد کے عہد کی دلّی کی مرثیہ خوانی، مزاج صندی، رنگ حریفانہ، مصروفیت، شاگردوں اور دوستوں کو خط لکھنا اور اس میں ساری دلّی کی چلتی پھرتی تصویریں اتارنا۔ آم کھانا دل بہلانا، جوا کھیلنا اور کبھی کبھی کوتوالی کی سیر کر آنا۔ اس پر سے اترانا تو دیکھئے پہلے گرہے کی قید میں ثواب کانے کی۔ شرم نہ آئی تمہیں یہ کہتے۔ کبھی کعبہ جاتے تو شرم بھی آتی۔ مگر جاتے کیسے، کبھی ادھر کا رخ کیا ہو تو جائیں۔ تمہارے آگے تو کلیسا تھا۔

واہ مرزا صاحب خوب زندگی گزاری آپ نے۔ دن کو روٹی کھائی رات کو شراب پی۔ جی بھر کے قرض لیا۔ ادا کریں تمہارے دشمن۔ پھر ہمیشہ ہائے ہائے کرتے رہے۔ مفلس نادار قلاش۔ بڈھا، ناتواں بیمار کسی نے کہا بھی کہ خدا کے غضب سے ڈرو اس نے تمہیں کلام و کمال سے نوازا ہے تو کہا ان معاملات سے قطع نظر کرو۔ اور حالی بس اللہ میاں کی گائے تھے۔ وہ بھی آنکھ میں وہ جوہر ہی نہ تھا جو کسی کا عیب دیکھ سکتا۔ اس کے لئے بھی نظر چاہیے۔ چنانچہ ان برخوردار سعادت اطوار نے آپ کے عیب کو ہنر کر دکھایا۔ ظریف، رند مشرب، آزادہ رو، ولی صفت، غم خوار، درد مند، نکتہ داں، وسیع القلب، گداز طبیعت، غم کا حریف، حیات کا عاشق، مرنجان مرنج... شاید ہی لغت میں کوئی اچھی صفت والا لفظ یا ترکیب چھوٹ رہی ہو جو انہوں نے آپ کی تعریف میں استعمال نہ کی ہو۔ مگر اس سے ہوا کیا۔ شاگردوں کا کام ہی مدح خوانی کرنا ہے۔ جنھیں چاہنے والا کوئی نہیں ہوتا انھیں شاگرد چاہتے ہیں۔ تفتہ، مجروح، حالی یہ سب کے سب آپ کے شاگرد۔ انہوں نے آپ کو مانا بھی تو کیا۔ بات تو جب تھی جب اس وقت کے گرگِ باراں دیدہ پہلوانانِ سخن آپ کا لوہا مانتے۔ وہ پیشہ ور اہل دانش جو مرغ بٹیر کی پالی نہیں شاعروں کی پالی

رکھتے ہیں۔

آپ اپنے منھ میاں مٹھو بنتے رہے۔ مرد افگن عشق، ساقی نواز۔۔۔ کبھی دھمکی دی کہ ہم نہ ہوں گے تو سیلاب بھی کس کے گھر جائے گا۔ کبھی حسن کے ماتم گسار و سیہ پوش ہو جانے کی دھمکی دی۔ مگر نتیجہ معلوم شد۔ کسی نے بات بھی نہ پوچھی کہ میاں دلّی میں رہتے ہو کھاؤ گے کیا؟

مگر بارہ برس بعد تو گھورے کے دن بھی پھرتے ہیں۔ ان سو سالوں میں آپ نہ سہی مگر آپ کا نام تو خوب چمکا۔ کسی نے تصویریں اور کسی نے کارٹون بنا کر پبلسٹی کی تو ادھر ایک پلٹن کی پلٹن ادیبوں اور شارحوں کی آپ کے نام پر کتابیں چھپوا چھپوا کر وید مقدس سے دیوان غالب کے ڈانڈے ملانے اور آپ کو اردو کا تاج محل ثابت کرنے پر تلی رہی۔ اور آج کل تو بس ہر طرف تمہارا ہی چرچا بکھر رہا ہے۔ جہاں جاؤ تمہارا ... نام، جدھر سے گزرو تمہارا ہی ذکر۔ گلی گلی۔ محلہ محلہ گاؤں گاؤں اور شہر شہر آپ کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے بلکہ ڈھنڈورا پٹ رہا ہے سن سن کر گور میں خلد کا در کھل گیا ہو گا۔ اسی لئے تو آپ کو آوازیں دیتے دیتے ہمارا گلا پڑ گیا۔ مگر آپ ہیں کہ جواب ندارد۔ مزاج پہلے ہی سے جو تھا سو تھا اب ساتویں آسمان پر جا پہنچا ہو گا۔ تو تعجب کی کیا بات ہے۔

اور سنئے جناب اب تو آپ انٹرنیشنل ہو گئے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کا کیا ذکر ایران، توران، ثمرقند و بخارا۔ روس و امریکہ، لندن و پیرس ہر جگہ تمھیں تم ہو۔ اے کاش کوئی ابن مریم آج نہ ہوا ورنہ تم ان دنوں اپنے اس طرح ہاتھوں ہاتھ لئے جانے کو دیکھتے تو پھولے نہ سماتے۔ عمر بھر کے گلے شکوے مٹ جاتے۔ ڈنڈا، لوٹا اور سوت کی رسی کے بغیر ہی ساری دنیا گھوم آتے۔ اعلیٰ درجے کی ہوٹلوں میں ٹھہرائے جاتے اور پینے کو ایک سے ایک بڑھیا شراب ملتی اور قدم قدم پر حسن بتاں سے ضیافت ہوتی۔ اگر جیتے رہتے تو اپنی آنکھوں یہ سب دیکھ لیتے۔ ہائے افسوس عمر نے وفا نہ کی۔

مگر اے وہ کہ آپ کا مزاج عرش معلیٰ پر تھا، قبلہ کو بھی قبلہ نما سمجھتے، ادراک سے پرے مسجود کو ڈھونڈھتے۔ آج تم ہوتے تو واللہ مزا آجاتا۔ تمہارے نام پر جو ہڑبونگ مچی ہے اس سے تمہارا دم الٹنے لگتا، جسے دیکھو آج تمہارا عاشق نہ ہوا، ایک وبا ہو گئی جسے اس میں مبتلا ہے۔ تم تو وباؤں میں مرنے کے قائل نہ تھے۔ پھر عاشقوں کی اس وبا کی کس طرح تاب لاتے؟ تم نہ ہوئے خام مال ہوئے کہ ہر ایک تمہارا کاروبار کر رہا ہے۔ بہریان بیڑی والے نے تمہارے رخ زیبا، چہرۂ ترکانہ و ادائے مستانہ کی داد یوں دی ہے کہ تمہاری تصویر چھاپی اور تمہیں کیلنڈر بنا کر لٹکا دیا۔

فلم والوں نے بیڑا کیا تو کیا تھا تو کیا ہوا مزار پر سنگ مرمر کی جالی بھی تو لگوا دی۔ مگر یہ کاروباری تو اتنا بھی نہیں کرتے۔ پوسٹ والے تمہیں چھاپ چھاپ کر پندرہ پیسے فی غالب کی مہر لگا رہے ہیں جسے ڈھنگ سے بولنا، محفل میں منہ کھولنا نہ آتا تھا اب جلسے جلوسوں میں تم پر دھواں دھار تقریریں کرتا ہے۔ جسے کبھی دو لفظ ڈھنگ کے لکھنا نہ آئے وہ تم پر کتابیں تصنیف کر رہا ہے۔ جنھیں اپنے ہی دیش میں دوسرے شہر جانے کی فرصت تھی نہ استطاعت وہ اب تم پر فاتحہ پڑھنے دیس بدیس گھوم آئے۔ جو تمہارے نام کا ٹھیک طرح تلفظ نہیں کر سکتے وہ تمہاری سرپرستی کا دعویٰ کرنے لگے۔ جو تمہاری زبان کو آج برداشت نہیں کر سکتے وہ بھی عاشق زار بنے تمہارا نام رٹتے جا رہے ہیں۔ گانے والے اور والیوں نے تمہاری غزلوں کو فلمی دھنوں میں بٹھانے کے لئے ایسی ایسی نادر اصلاحیں دی ہیں کہ تم سنتے تو سر دھنتے۔ آج تو تم جادو کی طرح ہر ایک سر پر چڑھ کر بول رہے ہو۔

اور تم جو اتنے شدید انفرادیت پسند تھے، جدت پسند تھے اور خدا جانے کیا کیا پسند تھے اپنے کو یوں ہر کوچہ و بازار میں رسوا دیکھتے، ہر بوالہوس کی غالب پرستی سے دو چار ہوتے تو پھر مرنے کی تمنا

کرنے لگتے۔

براہمت، مانتا خدا لگتی کہیں گے۔ تم کو سمجھنا اور چاہنا مشکل ہے۔ یہ شرط سمجھنے کی غائب کردو۔ بھلا کوئی کرے بھی تو کیا تم اردو لکھتے ہو تو بھی فارسی کی وہ ٹھونسم ٹھانس کر دم الٹ جائے اور تمہارے چاہنے والوں نے کبھی فارسی کالج میں پڑھی نہ گھر پر مولوی صاحب نے پڑھائی۔ بعض چاہنے والے تو ایسے بھی ہیں کہ ان کے گھر میں فارسی تو کیا سرے سے کوئی کتاب ہی نہیں۔ سمجھ نہیں کہہ کر تم کو سمجھیں تو کیسے سمجھیں۔ ہاں صرف چاہنا آسان ہے۔

پھر آج کل تو فیشن کے لحاظ سے چلنا ہوتا ہے۔ اس سال بھر کا فیشن تم اور صرف تم رہے۔ تمہیں نہ چاہیں تو کم نظر کہلائیں۔ تم کو چاہیں تو سمجھ نہ پائیں۔ اس لئے اب تمہاری زبان کا بعض دور اندیشوں نے اچھا حل ڈھونڈ نکالا۔ ورنہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر تمہارا شو سالم کا سالم بغیر رکے بغیر اٹکے پڑھنا مشکل تھا۔ اس لئے انھوں نے طے کر دیا کہ رسم الخط بدل دو چھٹی ہو جائے گی۔ تمہاری وجہ سے اکثر احساس کمتری میں مبتلا ہوا کرتے تھے اس لئے یہ بھی سوچ رکھا ہے کہ عاشق بن کر تمہاری چھیتی زبان ہی کو بازار سے غائب کردیں۔ اس کے بعد وہ جو جی چاہے تم پر کہیں، طرح طرح کی موشگافیاں کرلیں پھر کون پوچھنے والا ہوگا کہ میاں ہمارے منہ میں بھی زبان ہے۔

تم نے عمر بھر نہ نماز پڑھی ہوگی نہ روزہ رکھا ہوگا۔ زکوٰۃ دینے کی استطاعت ہی نہ تھی اور حج کی نیت تو اور بڑی بات ہے۔ پھر تمہاری بخشش کیسے ہوتی۔ چلو آج تمہارے بہانے اگر لوگوں کے کچھ کام نکلیں تو اس کا ثواب تمھیں کو ملے گا۔ ناکاروں کو اگر تمہارے ذکر نے کارآمد بنا دیا تو اس سے بڑھ کر نیکی کیا ہوگی۔ بلیک مارکٹنگ آج کا چالو دھندا ہے۔ اس سال سونے چاندی اور کسی اور چیز کی نہ سہی تمہاری سہی۔ آج تمہارے نام کے بہانے ہر چھوٹے بڑے سے ملا جا سکتا ہے۔ لوگوں کو بلایا جا سکتا ہے۔ لوگوں کو خوش کیا جا سکتا ہے، سرپرستوں کو خوش کیا جا سکتا ہے۔ بھول بہائے جا سکتے ہیں۔ انانیت کی ہر طرح تسکین کی جا سکتی ہے ـــ اسی لئے تو ہر شخص آپ کا پبلسٹی آفیسر بن بیٹھا ہے کہ اس کی پبلسٹی بڑی آسانی سے ہو جاتی ہے۔ اس پبلسٹی پر یاد آیا کہ اگر لالہ وگل کی بجائے انسان کے روپ میں پھر جنم لینا چاہو تو یہ بہترین موقع ہے تمہاری اتنی پبلسٹی ہو چکی ہے کہ تم چاہو تو کسی جگہ سے بھی الیکشن لڑ سکتے ہو۔ انتخابی نشان کی بھی ضرورت نہیں اپنی تصویر ہی سے کام نکل جائے گا۔

مگر ہم کب سے بکے جا رہے ہیں ا[ور] تم چپ ہو۔ ایک خاموشی ہے سب کے جوا[ب] میں۔ ٹھیک ہے نشہ اتر جائے فیشن بدل جائے تو دیکھا جائے گا۔ ●●

رشید احمد صدیقی
(فن اور شخصیت)

از

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

قیمت : ۷ روپے

ملنے کا پتہ: نیشنل بکڈپو چارکمان
ادبی ٹرسٹ بک اسٹال عابد روڈ

غالب کے لطیفے

لکھنؤ کی ایک صحبت میں جبکہ مرزا وہاں موجود تھے۔ ایک روز لکھنؤ اور دلی کی زبان پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے مرزا سے کہا کہ جس موقع پر اہل دلی "اپنے تئیں" بولتے ہیں وہاں اہل لکھنؤ "آپ کو" بولتے ہیں۔ آپ کی رائے میں فصیح "آپ کو" ہے یا "اپنے تئیں"؟ مرزا نے کہا فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ بولتے ہیں مگر اس میں دقت یہ ہے کہ مثلاً میری نسبت یہ فرمائیں کہ میں آپ کو فرشتہ خصائل جانتا ہوں اور میں اس کے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض کروں کہ میں تو آپ کو کتے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں' تو سخت مشکل واقع ہوگی میں تو اپنی نسبت کہوں گا اور آپ ممکن ہے کہ اپنی نسبت سمجھ جائیں۔ سب حاضرین یہ لطیفہ سنکر پھڑک گئے مرزا کا مطلب صرف اس قدر بیان کرنا تھا کہ "آپ کو" مخاطب کے لئے تو عموماً بولا ہی جاتا ہے۔ اگر متکلم کے لئے بھی اس کا استعمال ہوگا تو بعض موقع پر التباس واقع ہوگا اس مطلب کو انہوں نے اس لطیفہ پیرائے میں بیان کیا۔ مگر یہ فقط ایک لطیفہ اہل صحبت کے خوش کرنے کے لئے تھا۔ ورنہ اہل دلی بھی اکثر بجائے "اپنے تئیں" کے "آپ کو" بولتے ہیں اس میں کچھ اہل لکھنؤ کی خصوصیت نہیں ہے۔

•

دلی میں رتھ کو بعضے مونث اور بعض مذکر بولتے ہیں کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ حضرت! رتھ مونث ہے یا مذکر؟ آپ نے کہا بھیا! جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مونث کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر سمجھو۔

•

جب مرزا کرنل برون کے روبرو گئے تو اس وقت کلاہ پپاخ انکے سر پر تھی۔ انہوں نے مرزا کی نئی وضع دیکھکر پوچھا کہ ول تم مسلمان؟ مرزا نے کہا آدھا۔ کرنل نے کہا اس کیا مطلب؟ مرزا نے کہا شراب پیتا ہوں' سور نہیں کھاتا۔" کرنل یہ سنکر ہنسنے لگے۔ پھر مرزا نے وزیر ہند کی چھٹی جو ملکہ معظمہ کے مدحیہ قصیدہ کی رسید اور جواب میں آئی تھی۔ دکھائی۔ کرنل نے کہا کہ تم سرکار کی فتح کے بعد پہاڑی پر کیوں نہ حاضر ہوئے؟ مرزا نے کہا "میں چار کہاروں کا افسر تھا' وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے میں کیونکر حاضر ہوتا؟ کرنل نے نہایت مہربانی سے مرزا اور ان کے تمام ساتھیوں کو رخصت کر دیا۔

•

جب نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہو گیا اور مرزا تعزیت کے لئے رامپور گئے چند روز بعد نواب کلب علی خاں مرحوم کا لفٹننٹ گورنر سے ملنے کو بریلی جانا ہوا ان کی روانگی کے وقت مرزا بھی موجود تھے۔ چلتے وقت نواب صاحب نے معمولی طور پر مرزا صاحب سے کہا خدا کے سپرد مرزا نے کہا حضرت خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے آپ پھر الٹا مجھ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔"

•

مولوی امین الدین کی کتاب "قاطع قاطع برہان" کا جواب مرزا نے کچھ نہیں دیا کیونکہ اس میں فحش اور ناشائستہ الفاظ کثرت سے تھے۔ کسی نے کہا حضرت! آپ نے اس کا کچھ جواب نہیں لکھا۔ مرزا نے کہا مرزا نے کہا اگر کوئی گدھا تمہارے لات مارے تو کیا تم بھی اس کے لات مارو گے!

•

مرزا صاحب کھانا کھا رہے تھے۔ چٹھی رساں نے ایک لفافہ لاکر دیا۔ لفافے کی بے ربطی اور کاتب کے نام کی اجنبیت سے ان کو یقین ہوگیا کہ یہ کسی مخالف کا ویسا ہی گمنام خط ہے جیسے پہلے آچکے ہیں۔ لفافہ مجھ کو دیا کہ اس کو کھولکر پڑھو۔ میں خود دیکھتا ہوں تو فی الحقیقت سارا خط فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا۔ پوچھا کس کا خط ہے؟ اور کیا لکھا ہے؟ مجھے اس کے اظہار میں تامل ہوا۔ فوراً میرے ہاتھ سے لفافہ چھین کر فرمایا کہ شاید آپ کے کسی شاگرد معنوی کا لکھا ہوا ہے۔ پھر اول سے آخر تک خود پڑھا اس میں ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی تھی مسکراکر کہنے لگے کہ "اس الّو کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔ بڈھے یا ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تاکہ اس کو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اس کو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ قرمساق جو بہتر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ کون بے وقوف ہوگا؟

•

ایک دفعہ کہیں مرزا تفتہ نے یہ لکھ دیا تھا کہ آپ نے بسبب ذوق سخن کے اصلاح اشعار منظور فرمائی تھی۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں: "لاحول ولا قوۃ! کس ملعون نے بسبب ذوق شعر کے اشعار کی اصلاح منظور رکھی؟ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بے زار ہو۔ میں نے بطریق تہہ درویش بجان درویش لکھا تھا جیسے اچھی جورو بڈھے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے۔ میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔"

●

ایک دن دیوان افضل اللہ خاں مرحوم جیٹ میں سوار مرزا کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو انہوں نے ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا مضمون یہ کہ آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اس طرف سے گزریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں۔ جب یہ رقعہ دیوان جی کے پاس پہنچا وہ نہایت شرمندہ ہوئے اور اسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔

●

ایک روز دوپہر کا کھانا آیا، اور دستر خوان بچھا، برتن تو بہت سے تھے مگر کھانا نہایت قلیل تھا مرزا نے مسکرا کر کہا "اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجئے تو میرا دستر خوان یزید کا دستر خوان معلوم ہوتا ہے اور کھانے کی مقدار کو دیکھئے تو بایزید کا"

●

حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے ان کو آم نہیں بھاتے تھے۔ ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے۔ اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لئے گلی سے گزرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے، گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیا۔ حکیم صاحب نے کہا دیکھئے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔" مرزا نے کہا "بے شک گدھا نہیں کھاتا۔"

مرزا کی نیت آموں سے کسی طرح سیر نہ ہوتی تھی۔ اہل شہر تحفہ بھیجتے تھے، خود بازار سے منگواتے تھے۔ باہر سے دور دور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا۔ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی رائے بیان کرو۔ مرزا نے کہا "بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونا چاہئیں۔ میٹھا ہو اور بہت ہو۔" سب حاضرین ہنس پڑے۔

●

ایک دفعہ رات کو پلنگ پر لیٹے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تاروں کی ابتری بے نظمی اور انتشار دیکھ کر بولے "جو کام خود رائی سے کیا جاتا ہے اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ ستاروں کو تو دیکھو کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں۔ نہ تناسب ہے نہ انتظام ہے، نہ بیل ہے نہ بوٹا ہے، مگر بادشاہ خود مختار ہے، کوئی دم نہیں مار سکتا۔

●

رمضان کا مہینہ تھا۔ ایک سنی مولوی مرزا سے ملنے کو آئے۔ عصر کا وقت تھا مرزا نے خدمت گار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے تعجب سے پوچھا کیا جناب کا روزہ نہیں ہے؟ مرزا نے کہا سنی مسلمان ہوں چار گھڑی دن رہے روزہ کھول لیتا ہوں۔

●

جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرا سامنے رکھا تھا۔ طوطا سردی کے سبب پروں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ مرزا نے دیکھ کر کہا۔ میاں مٹھو! نہ تمہارے جورو نہ بچے تم کس فکر میں یوں سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہو؟

●

ایک دفعہ شہر میں سخت وبا پڑی۔ میر مہدی حسین مجروح نے دریافت کیا کہ حضرت وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی تک موجود ہے؟ اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔ بھئی کیسی وبا؟ جب ایک ستر برس کے بوڑھے اور ستر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکی تو تف بر این وبا!

●

رمضان مبارک کا مہینہ تھا۔ آپ نواب حسین مرزا صاحب کے ہاں بیٹھے تھے۔ پان منگا کر کھایا۔ ایک صاحب فرشتہ سیرت نہایت متقی و پرہیزگار اس وقت حاضر تھے۔ انہوں نے متعجب ہو کر پوچھا کہ قبلہ! آپ روزہ نہیں رکھتے؟ مسکرا کر فرمایا "شیطان غالب ہے۔"

●

جاڑے کا موسم تھا۔ ایک دن نواب مصطفیٰ خاں صاحب مرزا کے گھر آئے۔ آپ نے ان کے آگے شراب کا گلاس بھر کر رکھ دیا۔ وہ ان کا منہ دیکھنے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ پیجئے۔ بھول کر وہ تائب ہو چکے تھے۔ انہوں نے کہا میں تو توبہ کی میں شراب نہیں پیتا۔ آپ متعجب ہو کر بولے کہ ہیں! کیا جاڑے میں بھی؟

●

ایک صاحب نے ان کو سنانے کو کہا کہ شراب پینی سخت گناہ ہے آپ نے ہنس کر کہا بھلا جو پئے تو کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا "ادنیٰ بات یہ ہے کہ دعا قبول نہیں ہوتی۔" مرزا نے کہا آپ جانتے ہیں شراب پیتا کون ہے اول تو وہ کہ ایک بوتل اولڈ ٹام کی بآسانی سامنے حاضر ہو، دوسرے بے فکری، تیسرے صحت۔ آپ فرمائیے کہ جسے یہ سب کچھ حاصل ہو اسے اور چاہئے کیا جس کے لئے دعا کرے

احمد جمال پاشا

غالب اینڈ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ

جب غالب کا چلن بڑھا اور غالبیوں نے غالب صدی تک منانے کی تیاریاں شروع کر دیں تو مسٹر سرپھٹول' جو ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے زمرہ شرفا سے مولانا بلکہ بقلم خود علامہ تک ہو چکے تھے اور جو عرصہ سے میر۔ سوز کا مردہ زندہ کرنے میں سرکاڑی' پسینہ بہائے ہوئے تھے۔ اچانک "میرئیے" سے "غالبئے" ہو گئے کیوں کہ مرزا کی صدی کا معاملہ تھا اور مولانا اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کی زندگی لاکھ لمبی ہو مگر وہ سو سال کسی حالت میں بھی زندہ نہیں رہ سکتے! چنانچہ ان کے اس محتاط اندازہ کے مطابق اب غالبئے ہونے میں زندگی بھر کی روٹیوں کا ٹھکانا اور مرغن کی امیدیں تھیں۔

مولانا سرپھٹول نے اس لئے آگا پیچھا دیکھتے ہوئے ایک عدد غالب اینڈ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ قائم کرڈالی وہ چپراسی سے ڈائرکٹر تک بن بیٹھے مگر کچھ ادبی وجوہات کی بنا پر انہوں نے ڈائرکٹر ہی کہلانا پسند کیا اور چپراسی ہونے کی یار لوگوں کو ہوا بھی نہ لگنے دی۔

غالب اینڈ کمپنی کے زیر اثر انہوں نے ایک آل ایشیا قسم کی غالب نمائش بنا کر اس خود ساختہ فیڈریشن نمائش کی پبلسٹی کا کام سنبھال لیا۔

مولانا سرپھٹول کے ایک بد ترین نقاد کے بقول اگر مولانا پڑھے لکھے ہی ہوتے تو وہ اردو کے برنارڈ شاہ قرار پاتے لیکن ان کے زبانی برنارڈ شاہ ہونے میں نہ کسی کو اعتراض ہے اور نہ ہو سکتا ہے کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ مولانا غالبئے نہ ہوتے تو ضرور کہیں نہ کہیں پبلسٹی افسر ہوتے۔

مولانا سرپھٹول نے چارج لیتے ہی بڑی دھوم دھام سے مرزا کی ایک نایاب تصویر ڈھونڈ نکالی اور جسے ایک قد آدم فریم میں لگوایا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک عدد جشن تصویر غالب برپا کیا جس میں چن چن کر وہ سبھی لوگ جمع کئے جن میں سے زیادہ تر نے اس جشن میں پہلی بار مرزا کا نام نامی اور اسم گرامی سنا تھا اور وہ مرزا سے ملاقات کے لئے بیتاب تھے بلکہ ان میں دو ایک معزز حضرات تو اس پر بھی تیار تھے کہ مرزا غالب کو ادبی پنشن جاری کروا دی جائے اور ایک صاحب نے تو یہ تہیہ تک کر لیا کہ اس بار کیوں نہ مرزا غالب کو پدم دی بھوشن کا خطاب دلوا دیا جائے۔

اخباروں اور رسالوں نے لمبی چوڑی تعریفوں کے ساتھ خاص طور پر مرزا کی تصویر شائع کی اور جب کسی بد ذوق نے اس طرف دھیان دلانا چاہا کہ مرزا کی یہی تصویر "نسخہ حمیدیہ" میں موجود ہے اور نگار غالب نمبر میں بھی چھپ کر عام ہو چکی ہے تو مولانا سرپھٹول نے یہ کہہ کر اسے چپ کروا دیا کہ غالب کی ایک ہی طرح کی دو تصویریں میں سے ایک نسخہ حمیدیہ میں چھپ کر جگہ جگہ نقل ہو چکی ہے اور دوسری ان کے پاس محفوظ ہونے کی وجہ سے نئی کا درجہ رکھتی ہے۔

مگر اس دانت توڑ اعتراض نے مولانا سرپھٹول کے دانت ایسے کھٹے کر دیئے کہ جہاں انہوں نے اور اعتراضوں کا جواب اس لئے نہ دیا کہ خاموش رہنا ہی عقلمندوں کا کام ہے وہاں انہوں نے بد ذوق غالبیوں کو غالب کی پھر کوئی دوسری نایاب تصویر

نہیں دکھائی۔

اس کے بعد مولانا سر پھٹول نے غالب اینڈ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ کے زیر اہتمام غالب کے غیر مطبوعہ خطوں کا ایک مجموعہ غالب کے غیر مطبوعہ خطوط چھپوایا جس کا افتتاحی جلسہ انہوں نے آل ایشیا سطح پر کیا یعنی ایک ملک کے صدر نے اس کا افتتاح کیا، دوسرے ملک کے وزیر اعظم نے اس کی صدارت کی اور تیسرے ملک کے بادشاہ نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ نتیجے کے طور پر مولانا سر پھٹول کی اس کتاب کی تمام جلدیں تینوں دیشوں کے کتب خانوں نے خرید لیں اور سارے ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔

جب کسی رسالہ یا اخبار کے ایڈیٹر تک کو مولانا کی یہ بین الاقوامی کتاب تبصرے کے لئے نہیں ملی تو ایک سر پھرے ایڈیٹر نے اپنے بیرونی ممالک کے دورے کے دوران ایک کتب خانہ سے خاص طور پر یہ کتاب نکلوا کر نوٹس بنا کر پڑھی اور اپنے ملک واپس آکر اس کتاب پر دھواں دھار تبصرہ کیا۔ اور خیالی انداز میں کتاب کو آسانی سے دو حصوں میں بانٹ دیا۔ پہلا حصہ یعنی پچاس فی صد خطوط "اردوئے معلیٰ" میں مل جاتے ہیں اور دوسرے حصے یعنی باقی پچاس فی صد نایاب خطوط "عود ہندی" میں محفوظ ہیں۔ باقی بچتا تھا۔ تعارفی دیباچہ وغیرہ جو دوسروں نے لکھے تھے مثلاً تعارف کی رسم مولانا بلخ زبانی نے ادا کی تھی۔ پیش لفظ گورنر جنرل بنجر ہاٹ کا لکھا ہوا تھا اور دیباچہ نواب بے ملک نے لکھا تھا۔ غیر جانبدار لوگوں کا دعویٰ تھا کہ اس عجیب و غریب کتاب میں مولانا سر پھٹول کے نام کے سوا اُن کا اپنا کچھ بھی نہیں ہے اور باقی جو کچھ بھی ہے دوسروں کا ہے۔ انہیں شک ہے کہ اُن دوسروں نے بھی انہیں کسی اور تیسروں سے لکھوایا ہوگا۔

اس ایڈیٹر نے یہ تبصرہ ان تین دیشوں کے اخباروں اور رسالوں میں اشاعت کے لئے دیا جس کے سبب تینوں دیشوں میں مولانا "بلیک لسٹ" کر دیئے گئے اس المناک حادثہ کے بعد مولانا نے یو۔ این۔ او کے رکن ممالک کی فہرست منگوا کر دیکھی اور اطمینان کا سانس لیا کہ دنیا کے ملکوں کی اکثریت ایسی ہے جہاں وہ بلیک لسٹ میں نہیں ہے اور اپنا کاروبار ان میں اچھی طرح چلا سکتے ہیں۔

اس کے بعد مولانا سر پھٹول نے بڑی کوششوں کے بعد غالب کے غیر مطبوعہ شعروں کو "طاق مینا" کے نام سے اکٹھا کیا مگر افسوس یہ کہ یہ کتاب ابھی پریس میں ہی تھی اور اس کی افتتاحی تقریب کی تیاریوں پر غور ہی رہا تھا کہ کوئی ظالم حاسد کاتب سے ساز باز کر کے اس کی نقل لے اڑا اور جس دن غیر مطبوعہ "غالب کے شعر" کتاب شائع ہوئی اسی دن کچھ حاسد غالبیوں نے یہ بیان جاری کر دیا کہ غالب کے نام سے یہی کتاب اس سے پہلے مولانا عبدالباری آسی چھپوا چکے ہیں۔ نزاعی کتاب ہونے کے سبب کتاب تو ہاتھوں ہاتھ بک گئی مگر اس کا کسی غالب کے طرفدار نے سنجیدگی کے ساتھ کوئی نوٹس نہیں لیا۔

اس حادثہ کے بعد مولانا سر پھٹول نے مرزا غالب کی تخلیقات سے ادب کی طرف سے بالکل آنکھیں پھیر لیں اور مرزا غالب اینڈ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ کا کاروبار انہوں نے مرزا کی شخصیت کو ابھارنے تک محدود کر دیا۔

یہی کاروبار تھا جسے وہ آخری دم تک نہایت مستعدی اور ہمت سے چلانے کا اب ارادہ کر چکے تھے چونکہ یہ ان کا اصلی میدان تھا اس لئے اس میں اُن کے جوہر بہت جلدی کھل گئے اور غالب سے زیادہ خود ان کی دھاک جمتی چلی گئی۔

مولانا سر پھٹول روزانہ غالب کے سلسلہ میں ایک بیان جاری کرتے جس میں ہمیشہ غالب سے زیادہ اپنے آپ کو سامنے رکھتے۔

سب سے پہلے تو انہوں نے مطلع پر دھیان دیا اپنی آل ایشیا ادارے کی شاخوں کے بھی بیان اور خبریں غالب کمپنی سے جاری کرتے اس کے بعد انہوں نے دور دور مقامات پر بھی غالب

کمیٹیاں قائم کرنا شروع کردیں ۔ مثلاً ایورسٹ میں غالب کمیٹی کی خبر یوں چھپی تھی ۔

"جاپانی کوہ پیما پارٹی جو اس بار ایورسٹ کی چوٹی سر کرنے جائے گی وہ اپنے ساتھ مرزا غالب کی تصویر اور دیوان غالب بھی لے جائے گی ۔ چوٹی سر کرنے کے بعد یہ ایورسٹ غالب کمیٹی "یوم غالب" منائے گی پھر چوٹی پر مرزا کی تصویر لگا کر مرزا کا دیوان ایورسٹ پہاڑ کی چوٹی پر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دے گی "...

... اس سے پہلے کنچن جنگا اور قراقرم کی چوٹیوں پر بھی غالب کمیٹی مرزا غالب کو پہنچا چکی ہے ۔

یہ تو مولانا سر چھٹول کے غالبی بیانوں کا ایک نمونہ تھا ورنہ عام طور پر وہ اس قسم کے بیان جاری کرتے ہیں ، ڈربی ریس غالب کمیٹی ۔ اول آنے والے گھوڑے کو مرزا غالب کے نام کا اعزاز عطا کیا جائے گا ۔ فیملی پلاننگ غالب ہفتہ اس دوران بھی نس بندی کروانے اور صاحب اولاد خواتین کو دیوان غالب کی ایک ایک جلد پیش کی جائے گی ۔ خیال رہے کہ مرزا غالب فیملی پلاننگ کی تحریک کے علمبردار تھے اور انہوں نے زندگی بھر ایک دو یا تین بچے ۔ ہوتے ہیں گھر میں اچھے .. پر عمل کیا اور اس تعداد کو آخری عمر تک گھٹاتے ہی رہے ۔

غالب کمیٹی کے گرما اور سرما اجلاس کے بعد انہوں نے دریائی اجلاس ، پہاڑی اجلاس ریگستانی اجلاس اور پاتالی اجلاس تک کئے ۔

جب ان اجلاسوں سے کچھ فرصت ملی تو انہوں نے کمیٹی بازی پر اور دھیان دے کر کمیٹی کی معاشی حالت مضبوط کی مثلاً ادھر کہیں قحط پڑا یا بارش آئی اور انہوں نے غالب سیلاب امدادی فنڈ یا غالب خشک سالی فنڈ کے منہ کھول دیئے ۔ یہاں تک کہ اگر کہیں کہیں فتنہ فساد برپا ہو جاتا تو یہ غالب ریلیف فنڈ کی اپیل فوراً جاری کر دیتے ۔

اس کے بعد انہوں نے مرزا غالب کے سلسلے میں ٹریڈ یونین تحریک میں دلچسپی اور "غالب ہڑتال کم غالب ڈیز" یعنی اس دن دفتر یا کارخانہ میں کام کرنے کے بجائے مزدور اپنی مانگوں کی حمایت میں غالب ڈیز منائیں گے ۔ جب معاملہ یہاں تک بڑھا کہ "غالب بہشتی یونین" ، "غالب یار یونین" تک بنا ڈالیں تو کسی دشمن نے یہ ہوائی اڑا دی کہ ان میں سے کسی بھی یونین کو "غالب" کے یونین میں شامل ہونے کا کوئی گمان نہیں ہے تو معاملہ نزاکت اختیار کر گیا اور مجبوراً ڈائرکٹر غالب اینڈ کمپنی پرائیویٹ لمیٹیڈ مولانا سر چھٹول کو ایک وضاحتی بیان جاری کرنا پڑا جس میں وضاحت کم اور معافی زیادہ مانگی گئی تھی ۔

اس کے بعد ڈائرکٹر غالب کمپنی نے سو سالہ جشن غالب تقریب منانے کی اخباروں اور رسالوں میں بڑے زور شور سے تیاریاں شروع کر دیں ۔ اس کے ساتھ انہوں نے ایک عالی شان غالب نمبر نکالنے کا اعلان بھی کیا مگر ہوا یہ کہ غالب نمبر پر کام کرنے والے مولانا سے اتنے تنگ آ چکے تھے کہ انہوں نے خیر غالب اسی میں جانی کہ وہ سو سالہ غالب تقریب سے غالب کو دور ہی رکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو تقریب کمیٹی اس میں مولانا نے بنائی تھی اس نے مولانا کو کمیٹی سے غائب کر دیا اور غالب نمبر کی ایڈیٹر شپ سے ان کا نام اڑا دیا ۔

اس زبردست چوٹ نے ماہر غالبیات مولانا سر چھٹول کو مرزا غالب سے اتنا پریشان کر دیا کہ جس دن جشن غالب ہو رہا تھا اسی دن مولانا سر چھٹول "آل انڈیا اکبر اکیڈیمی" قائم کر رہے تھے تاکہ اکبر پر بھی کچھ کام ہو سکے ۔

•••

داڑھیاں لے سب بنیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

جوتے بھی کھا کے شاد اگر دل نہیں رہا
عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا

دو کوڑی بھی لگاتا نہیں دام اب کوئی
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغ حسرتِ ہستی لیے ہوے
میں پوٹلی اٹھانے کے قابل نہیں رہا

مجھ کس نکالا میرا پتنگوں نے رات بھر
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر میں
مردار موت مرنے کا قائل نہیں رہا

مدقوق تھا میں پہلے ہی مفلوج ہو کے اب
شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا

برروے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
چہرہ کسی کا دیکھنے کے قابل نہیں رہا

مصروفِ ہنگامستی ہیں ساقی سے بادہ نوش
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

ڈیلنگ بہ غزلِ غالب

از سرپٹ حیدرآبادی

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
مدخولِ دل خروج پہ مائل نہیں رہا

اعضائے جسم صاف نظر آ رہے ہیں اب
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
اس پر بھی غنڈہ گردوں میں شامل نہیں رہا

کی میں نے گرچہ اور بھی لوگوں سے عاشقی
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
دھنگر کوئی بھی کاشت کے قابل نہیں رہا

کفگیر و ڈوئی سمک بھی حسیں لے کے چل دیئے
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد
پٹ پٹ کے لڑنے بھڑنے کے قابل نہیں رہا

مطلع کا مصرعہ مقطع میں پھر سرپٹ آ گیا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

مسیح انجم

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے...

صدیوں سے ایصال ثواب کی رسم چلی آرہی ہے۔ اس معاملہ میں قدماء تو آپ ہم سے دو ہاتھ آگے ہی تھے۔ وہ مرحوم کیساتھ ناؤنوش کی وہ تمام چیزیں رکھتے جو انھیں پسند تھیں۔ یہی نہیں بلکہ اُن تمام چیزوں کا بھی اہتمام کرتے جن کے لئے مرحوم اپنی تمام زندگی میں ترس ترس کر جان بحق ہو گئے تھے۔ اس اہتمام کو دیکھ کر یقیناً ایک اچھے خاصے آدمی کا ضرور جی للچاتا کہ وہ بھی اس دنیا سے کوچ فرمائیے تاکہ قبر میں مزے لوٹے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ ملک کے گوشہ گوشہ میں صد سالہ "جشن غالب" بڑے ہی شان و شوکت سے منایا جارہا ہے۔ غالب کے نام پر چندے وصول کئے جارہے ہیں۔ لائبریریاں قائم کی جارہی ہیں۔ اسٹیج سجائے جارہے ہیں۔ جلسے ہورہے ہیں۔ ادبی نشستیں ترتیب دی جارہی ہیں۔ مقالے پڑھے جارہے ہیں۔ بڑے پیمانے پر مشاعرے منعقد کئے جارہے ہیں۔ غرض کہ وہ سب کچھ ہورہا ہے جو غالب اپنی زندگی میں دیکھ نہ پائے تھے۔ ان تمام روح پرور مناظر کو دیکھ کر شعرائے کرام کے دلوں پر کیا بیت رہی ہوگی، ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بھی اس دنیا سے رختِ سفر باندھنے کی سوچ رہے ہوں تاکہ قوم کو اُن کی شعری و ادبی خدمات کے متعلق سوچنے کا موقع ملے۔

"جشن غالب" کے ساتھ شعرائے کرام کی قسمتیں "جوالامکھی" کی طرح جاگ پڑی ہیں عدیم الفرصتی کا حیلہ ہاتھ آیا ہے۔ بیویوں پر "مشہور شاعر" ہونے کا رعب جمایا جارہا ہے۔ ناز نخرے بڑھ گئے ہیں۔ خیر چھوٹے شعراء کا ذکر ہی چھوڑیئے۔ لیکن ایسے ایسے شعراء جنھیں مشاعرے میں مدعو کرنا باعث توہین سمجھا جاتا تھا، جو، بن بلائے جہان کیطرح مشاعرہ میں آکر منتظمین مشاعرہ سے شعر سنانے کیلئے خوشامدیں کرتے تھے بلکہ ہوسکا تو رشوت تک دیتے تھے، آج اپنی مونچھوں پر تاؤ دیئے پھر رہے ہیں۔ گویا کہہ رہے ہوں "کیوں خباب! آج تو ہم نے اپنی شاعری کا لوہا منوا ہی لیا" ایسے موقع پر منتظمین مشاعرہ کو سوائے سرِ تسلیم خم کرنیکے کوئی اور چارہ نہیں رہتا۔ ہماری آنکھوں دیکھا حال ہے کہ "جشن غالب" کے ایک مشاعرہ میں ایک "نوزائیدہ شاعر" کو مدعو کرنیکے لئے ایک منتظم مشاعرہ نے ایسی ایسی خوشامدیں

کہیں جیسے رات کے وقت بغیر قندیل سیکل پکڑ لئے جانے پر بھی نہ کی جاتی ہوں۔ صرف سکان پکڑ کر اُٹھ بیٹھ کرنا، ناک رگڑنا، اکڑوں بیٹھنا اور پاپوشس بردای کرنا باقی رہ گیا تھا۔ لیکن اس پر بھی اُس ظالم کو ذرا رحم نہ آیا بڑی ہی متانت سے اپنا ہاتھ چھڑا کر چلے گئے۔ اگر واقعی ٹھنڈے دل سے غور کریں تو ایک شاعر کی اپنی زندگی میں لے دے کر ان ناز نخروں کے سوا کیا رہ گیا ہے۔ وہ کبھی کبھی ایسا مظاہرہ کرلے تو خندہ پیشانی سے برداشت کرلینا ہی چاہیئے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ "جشن غالب" اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور اس تحریک کے پیچھے کسی شاعر ہی کا ہاتھ ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بات اور بھی تو کہنی ہے۔ وہ یہ کہ، شاعری کی ابتدا کرنیکے لئے "جشن غالب" جیسا "سازگار موسم" مشاعرہ کی تاریخ میں کبھی آیا ہے اور نہ آئے گا۔

"جشن غالب" کے ساتھ ہی منچلے اور زندہ دل شعراء کی خوب بن آئی ہے۔ چنانچہ ایک شاعر نے پوچھا "جناب! کیا مشاعرہ میں شراب وکباب کا بھی انتظام ہے؟" اس پر منتظم مشاعرہ جو کہ بہت ہی نڈھال تھے، بوکھلا گئے۔ پھر غصہ سے بولے "جواب نہیں آپ کا بھی مذاق کا ایک وقت ہوتا ہے" یہ سنتے ہی شاعر محترم برہم ہو گئے۔ بولے "افسوس ہے! آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ غالب کا ذکر ہو اور ساغر و شراب موجود نہ ہو۔" منتظم مشاعرہ کب چپ رہنے والے جل کر بولے "تو گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ "جشن غالب" نہیں بلکہ "جشن مئے" منایا جائے۔ میکدے آباد کئے جائیں۔ شراب لنڈھائی جائے ....؟" نہ جانے وہ آگے اور کیا کیا کہتے کہ شاعر محترم نے فوراً ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر منہ بند کیا اور غالب کا یہ شعر تھوڑے سے تصرف (زاہد کے بجائے واعظ) کیساتھ پڑھا۔

کیوں رد و قدح کرے ہے واعظ
مئے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

شعر سننے کے بعد منتظم مشاعرہ مسکرا کر چپ ہو گئے۔

ایک اور شاعر نے تو حد ہی کر دی جب انھیں دعوت نامہ دیا گیا تو پوچھے "جناب! کیا "رمی" کا بھی انتظام ہے؟" اس پر منتظم مشاعرہ نے مسکرا کر کہا "حضرت! جوئے کو "جشن غالب" سے کیا تعلق؟" شاعر صاحب تپاخ سے بولے "کیوں نہیں! بہت بڑا تعلق ہے۔ کیا آپ واقف نہیں ہیں کہ غالب کو شطرنج اور چوسر کی لت تھی اور وہ اس سلسلہ میں سزائے قید بھی بھگت چکے تھے۔" یہ سنکر منتظم مشاعرہ جو کہ زندہ دل واقع ہوئے تھے بولے "آج کل شعرائے کرام کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ شہر کے پورے کارڈس (CARDS) بھی کافی نہ ہونگے۔ جس کے نتیجہ میں شعراء کو جوئے سے مستفید نہ ہونیکی شکایت رہیگی۔" شاعر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "کم از کم چت پٹ" کھیلنے کا ہی انتظام کرتے تو مناسب تھا۔ یہ تجویز سن کر منتظم مشاعرہ پر سکتہ طاری ہو گیا۔

اب ہم آپ کو کہاں تک بتائیں۔ ایک متشرع قسم کے شاعر نے خط لکھا کہ "جشن غالب" مئی کے مہینہ میں منایا جاتا تو ٹھیک تھا۔ مشاعرہ میں کم از کم آم تو کھانے کو مل جاتے اور غالب کی روح کو ثواب بھی پہنچ جاتا۔"

یہ تو صرف شعرائے کرام اور منتظمین مشاعرہ کی بات تھی۔ اب آپ "غالب فہم" حضرات سے ملئے۔ انھیں صرف اپنے مطلب کے اشعار یاد کرنے اور سمجھنے میں لطف آتا ہے۔ وہ اپنے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے غالب کو بطور سپر استعمال کرتے ہیں۔ یقین مانئے اگر غالب زندہ ہوتے تو ان کی "فہم" دیکھ کر سر پیٹ لیتے اور شاعری ترک کر دیتے۔ ایک ایسے ہی "غالب فہم" نے غالب کو اسقدر سمجھا کہ وہ غالب کے ایک شعر کا مکمل جیتا جاگتا نمونہ بن گئے ہیں۔ وہ اب مئے خانہ کی چار دیواری سے بالکل آزاد ہیں اور اکثر و بیشتر سڑک پہ کھڑے کھڑے اور بیٹھے بیٹھے شراب سے شغل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک دن حالت بے ہوشی میں جب ان کی جامہ تلاشی لیگئی تو بوتل پر یہ شعر نظر آیا۔

"جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو"

اب ہمیں یہ ڈر ہے کہ کہیں وہ اسقدر آزاد نہ ہو جائیں کہ کسی دن بوتل سمیت مسجد اور خانقاہ میں آدھمکیں۔

ایک اور اسی طرح کے "غالب فہم" پر ایک شعر کا اتنا غلبہ ہوا کہ وہ آخر وقت تک شراب کا ساتھ نبھاتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ نزع کے عالم میں بھی دو پیگ چڑھا کر اس دنیا سے سدھارے تاکہ قبر میں منکر نکیر

دھوکا دے سکیں۔

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے"

پتہ نہیں قبر میں مرحوم کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا۔

بعض "غالب فہم" کی شعر فہمی صرف چند چیدہ چیدہ مصرعوں تک ہی محدود ہے۔ وہ شعر کو شیر سمجھ کر قریب نہیں پھٹکتے۔ ان میں موقع و محل کے لحاظ سے مصرعے پڑھنے کا فقدان ہے۔ ایک ایسے ہی صاحب کا واقعہ سنیئے جنھوں نے اپنی بیوی سے تنگ آکر اپنے دوستوں کے سامنے یہ مصرعہ پڑھا

ع "چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی"

اب آپ ایک ایسے خود ساختہ محقق کا حال سنیئے جنھیں دعویٰ ہے کہ غالب پر اُن سے زیادہ اسٹیڈی کسی نے بھی نہیں کی ان کا نام سنکر ہمارا بھی جی چاہا کہ شرف نیاز حاصل کرلیں اور اُن کی معلومات سے استفادہ کریں۔ جب ہم ان کے مکان پہنچے تو وہ بڑے ہی پُر خلوص انداز میں ملے۔ علیک سلیک کے بعد ہم نے غالب کے تعلق سے استفسار کیا تو بڑی حقارت سے بولے "غالب، غالب، غالب! آخر غالب ہے کیا!؟" ہم نے دست بستہ عرض کیا "حضور! آپ سے بہتر اور کون جان سکتا ہے؟" فرمایا "ہاں، ہاں! ٹھیک ہے۔ سنیئے۔ غالب کے ماں باپ تھے۔ وہ اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہوئے بچپن میں کھیلے کودے۔ جوان ہوتے ہی انھوں نے شادی کی۔ بیوی سے بیزار تھے۔ ہر شاعر کی طرح شعر کہتے تھے اور شراب کے مداح تھے۔ آم انھیں بے حد پسند تھے۔ جب کافی عمر کے ہو گئے تو انتقال فرما گئے۔" ہمارا جی چاہا کہ فوراً اٹھ کر ان کے بلائیں لے لیں۔ لیکن فوراً ہی ہمیں ایک شرارت سوجھی۔ ہم نے کہا "معلومات کی تھوڑی سی بھیک اور دیجئے!" اس پر انھوں نے دماغ پہ بہت بار ڈالا۔ ہمیں تو ڈر ہو رہا تھا کہ کہیں ان کے دماغ کی شریانیں نہ پھٹ جائیں اور ہم پر قتل کا الزام نہ آئے۔ قبل اس کے کہ کوئی حادثہ پیش آتا، وہ ایک دم چونک پڑے اور بولے۔ "ہاں! ایک بات آخر چھوٹ ہی گئی۔ غالب گالی دینے کے فن سے خوب واقف تھا۔ ایک مرتبہ اس نے برہم ہو کر کہا تھا کہ لوگوں کو گالیاں تک دینے کا سلیقہ نہیں۔"

جب ہماری جنرل نالج میں ان بے مثال معلومات کا اضافہ ہوا تو ہم نے پھر پوچھا "جناب! یہ عود ہندی کیا ہے؟" تڑسے بولے "یہ تو ہندی ریڈر کا نام ہے"۔ ہم نے اپنے قہقہہ کو ضبط کرتے ہوئے مزید پوچھا "یہ اُردوئے معلّٰی کیا بلا ہے؟" یہ سننا ہی تھا کہ وہ غصہ سے لال پیلے ہوگئے بولے "معلّٰی کا تعلق مذہب سے ہے۔ آپ خواہ مخواہ مذہب کو درمیان میں کیوں لا رہے ہیں؟" چونکہ ہنسی ضبط کرنے کی وجہ سے ہمارا برا حال ہو گیا تھا۔ اسلئے فوراً خدا حافظ کہے بغیر باہر آگئے۔

یہ تو ایک محقق کی بات تھی۔ اب آپ "معتقدین غالب" سے ملئے۔ انھیں صرف غالب کے نام سے ایک خاص قسم کا لگاؤ ہے۔ اس تعلق سے ایک دلچسپ واقعہ سنیئے۔ ہمیں اپنے ایک دوست کی مزاج پُرسی کیلئے "چار مینار دواخانۂ یونانی" جانیکا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک میاں اور بیوی میں بچہ کا نام رکھنے کے تعلق سے کافی بحث و مباحثہ ہو رہا تھا۔ چونکہ اتفاق سے وہ ان کی پہلی اولاد تھی اسلئے نام رکھنے کے معاملہ میں طلاق اور خلع کا شدید امکان تھا۔ اُس وقت ایک "معتقد غالب" نے بڑی ہی خوش اسلوبی سے اس سنگین مسئلہ کو حل کر دیا۔ انھوں نے کہا "چونکہ بچہ جشن غالب کے دنوں میں پیدا ہوا ہے، "غالب" نام رکھا جائے۔ اس پہ دوسرے "معتقد غالب" نے کہا "غالب" کیساتھ لفظ "جونیر" کا اضافہ ضرور کیا جائے کیوں کہ اس بات کا شدید خطرہ لاحق ہے کہ مستقبل میں غالب کی شخصیت ایک نزاعی مسئلہ بن جائے۔

آخر کار اُن کی رائے متفقہ طور پہ منظور کر لی گئی اور نو مولود کو "جونیر غالب" کے نام سے نوازا گیا۔

ایک اور "معتقد غالب" نے جو خیر سے ایک جواں سال نو مشق شاعر بھی ہیں۔ "جشن غالب" کے موقع پر اسواسطے شادی کرلی کہ ان کی شادی ایک تاریخی حیثیت اختیار کرلے۔ لیکن ہم کہینگے کہ اُنھوں نے یہ شادی رچا کر کوئی دانشمندانہ حرکت نہیں کی۔ کیونکہ جب غالب اپنی بیوی سے نالاں تھے تو پھر

ان صاحب کی شادی کب کامیاب ہوگی۔

غالب کے تعلق سے یہ مشہور ہے کہ وہ عالم سرخوشی میں شعر کہتے تھے اور کمر بندھ میں گرہ لگاتے تھے۔ یہ الفاظ دیگر وہ اشعار کو کمر بندھ کی گرہوں میں محفوظ کر لیتے تھے۔ صبح جب وہ گرہیں کھولتے تھے تو شعر برآمد ہوتے تھے۔ ایک "معتقد غالب" کو جب یہ معلوم ہوا تو محض غالب کی اس ٹکنک پر طبع آزمائی کرنے کے لئے انھوں نے شراب نوشی شروع کی۔ ایک دن وہ عالم سرخوشی میں شعر کہتے ہوئے کمر بندھ کی طرف متوجہ ہوئے تو پتہ چلا کہ پتلون پہنے ہوئے ہیں۔ اس پر انھیں ایک ترکیب سوجھی۔ انھوں نے فوراً اپنا پتلون اتار ڈالا اور "انڈر رویر" پر شعر کہنے لگے۔ صبح جب انھوں نے کمر بند کی گرہیں کھولیں تو حیرت میں پڑ گئے۔ گرہوں سے جو شعر برآمد ہوئے وہ فن شاعری کی پابندیوں سے بالکل آزاد تھے۔

اوپر چونکہ نام رکھنے کا ذکر آ ہی گیا ہے اس لئے یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اب غالب مختلف بورڈس پر جلوہ گر ہونگے۔ جیسے "غالب بار"، "غالب کلب"، "غالب آم شاپ"، "غالب کتاب گھر"، "غالب لائبریری"، "غالب ہیر کٹنگ سیلون" وغیرہ وغیرہ۔ معتبر ذرائع سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ایک "معتقد غالب" نے "غالب پان شاپ" کھول کر سب پر سبقت لے جانیکا اعزاز پالیا ہے۔

اور اب ہمیں اس "صد سالہ جشن غالب" اور جلسوں کو دیکھ کر یہ خوف ہو رہا ہے کہ کہیں ایک اور "غالب شکن" پیدا نہ ہو!! ۔

ڈاکٹر مسیح الزماں کی نئی تصنیف

"اُردو مرثیے کا ارتقاء"

— ابتداء سے انیس تک

"میں اسے مرثیہ کے تنقیدی ادب میں ایک اضافہ سمجھتا ہوں"

پروفیسر سید احتشام حسین

صفحات : ۵۱۴

قیمت ۱۴ روپیہ — ناشر: کتاب نگر، دین دیال روڈ لکھنو ۳

ہند و پاک کے ممتاز افسانہ نگار عوض سعید کے

۱۴ افسانوں کا مجموعہ

سائے کا سفر

صفحات : ۲۱۶

قیمت : ۴ روپیہ

ناشر: نیشنل بک ڈپو، چار کمان، حیدرآباد

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے — جما کے ایک رکھوں گا یہ گفتگو کیا ہے
میں بھاگتا ہوں ذرا احتیاط کی خاطر — وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے
ہوئے ہیں عشق میں بے روزگار اے لوگو! — ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے
جلا ہے جسم جہاں، جیب جل گئی ہوگی — کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے
مجھے تو صرف ہے تاڑی کا شوق اے ساقی — یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے
رہی نہ طاقتِ گفتار دیکھ کر پولیس — سوائے بچ کے نکلنے کے آرزو کیا ہے

سنی سنائی پہ مشہور ہو گیا ورنہ
لتا سے بڑھ کے بھی غالب کی آبرو کیا ہے

پیروڈیاں

اسلم عمادی

ہم نے مانا کہ مداری کا کمال اچھا ہے — پھر بھی سرکس میں حسینوں کا جمال اچھا ہے
جیب خالی ہو تو کہتے ہیں فقیروں سے یہی — وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
کالے بازار میں ہے دھوم وزیروں کی بہت — اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
بیسواں بچہ گرانی میں ہوا ہے نازل — پھر بھی کہتے ہیں کہ یہ تازہ نہال اچھا ہے

جانتے سب ہیں پلاننگ کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

rekhta

ع— کبھی ہم اُنکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

داغ

ع— لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں مانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

وجاہت علی سندیلوی

ماہرِ غالبیات

ادھر کئی مہینوں سے مکان کی تلاش میں شہر کے بہت سے حصوں اور گوشوں کی خاک چھاننے اور کئی محلوں کی آب و ہوا کو نمونہ کے طور پر چکھنے کا اتفاق ہوا تو پتہ چلا کہ جس طرح ہر گلی کے لئے کم سے کم ایک کم تول پنساری ایک گھر کا شیر کتا، ایک لڑاکا ماں، ایک بدزبان بہو، ایک نصیحت کرنے والے بزرگ، ایک فضیحت پی جانے والا رند، اور حوائج ضروری سے فارغ ہوتے ہوئے بہت سے بچوں کا ہونا لازمی ہے اسی طرح کسی نہ کسی مجلس میں ایک ماہر غالبیات کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے اور بغیر اس کے گرد و پیش کا جغرافیہ کچھ ادھورا رہ جاتا ہے۔

اچھا بھلا ایک مکان مل گیا تھا۔ لیکن ابھی اس میں منجملہ اسباب ویرانی میرا لپٹا ہوا بستر بھی ٹھیک سے کھلنے نہ پایا تھا کہ محلے کے ماہر غالبیات نے نہیں معلوم کیسے سونگھ لیا کہ میں "سخن فہم" نہ سہی غالب کا طرفدار ضرور ہوں، اور مجھے اپنی "غائبانہ گرفت" میں ایک "صید زبوں" کی طرح جکڑ لیا۔ آتے ہی انہوں نے غالب کے متعلق دو چار حیرت انگیز انکشافات کے بعد مجھے پھانسنے کیلئے ایک آدھ ہلکا سوال کر دیا۔ اب میری حماقت ملاحظہ ہو —— کہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو بہت بڑا غالب فہم سمجھتا ہوں —— میں نے ان کو نرم چارہ سمجھ کر ان پر دو چار منہ مار دیئے یا یوں سمجھ لیجئے کہ ان کی دم پر پیر رکھ دیا یعنی ان کے سامنے غالب کو اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے پیش کرنے کی سعی لاحاصل کر بیٹھا مجھے کیا خبر تھی کہ میں کسی بارود کے خزانے کے قریب دیا سلائی جلانے کی کوشش کر رہا ہوں پھر کیا تھا یہ "آپ غالب کو غلط سمجھتے ہیں" بہ جیخ کر ماہر غالبیات پھٹ ہی تو پڑے مجھ پر! اور میری معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے فن غالبیات کی ایسی ایسی توپوں اور آتش فشانوں کے دہانے کھول دیئے کہ میں سراسیمہ، مبہوت اور ششدر ہو کر ہمیشہ کے لئے عہد کر بیٹھا کہ آئندہ کسی اجنبی بزرگ کے سامنے حضرت غالب کا نام اپنی زبان بے لگام سے ہرگز ہرگز نہ نکلنے دوں گا۔

دوسرے ہی دن سے ماہر غالبیات نے "آپ غالب کو غلط سمجھتے ہیں" کے عنوان سے میری باقاعدہ تعلیم شروع کر دی۔ سویرے میں بستر پر ہوتا کہ وہ لذت خواب سحر "پر دعا وا بولتے آ پہنچے اور غالب کے کچھ انتہائی سنگلاخ اشعار پڑھ کر ان کے معنی مجھ سے پوچھتے گویا میرا آموختہ سنتے۔ اور پھر قبل اس کے کہ میں ایک لفظ بھی اپنی زبان

Rekhta

سے نکال پاؤں وہ" آپ غالب کو غلط سمجھتے ہیں" کہہ کر ان کے معنی اور مطالب خود بیان کرنا شروع کر دیتے اور پھر اپنی گل فشانی گفتار سے جدت آفرینی، حسن، تخیل، لطفِ بیان، شکوہ الفاظ، بلند پروازی، ندرتِ کلام، بلکہ پھانس کو بانس اور رائی کو پہاڑ بنانے کے ایسے ایسے "گل کترتے" کہ میرے لئے صاعقہ و شعلہ و سیماب" کا عالم ہو جاتا اور وہ خود اس شعر کی مجسم تفسیر بن کر رہ جاتے ۔

آگہی دامِ شنیدن جسقدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

اور پھر نوبت یہاں تک پہنچتی کہ میں داڑھی بنا رہا ہوں اور غالب کا فلسفہ حسن سمجھا رہے ہیں۔ میں کنگھا کر رہا ہوں اور وہ آرائش جمال سے فارغ نہیں، ہنوز میں مسئلہ ارتقاء کو پروان چڑھتے دیکھ رہے ہیں۔ کپڑے بدل رہا ہوں۔ اور وہ "ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا" اور گا رہے بگلا ہے انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگا لگا کر غالب کو ہندوستان کا سب سے پہلا انقلابی ثابت کر رہے ہیں میں جوتے کی ڈوریاں باندھ رہا ہوں اور وہ "بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے" والے مصرع سے فضائے آسمانی پر اسپٹنک چھوڑ رہے ہیں۔ میں ناشتہ کر رہا ہوں اور وہ "مے سے یہ نگس کی تے نہیں ہے" دہرا دہرا کر غالب کے علم الغذا پر کچھ اس انداز سے روشنی ڈال رہے ہیں کہ میرے منہ کا نوالہ حلق میں جانے سے انکار کر بیٹھتا ہے۔ میں دفتر جانے کے لئے سائیکل نکال رہا ہوں اور وہ غالب کا فلسفہ عمرانیات بیان کر رہے ہیں۔ میں سائیکل پر بیٹھ چکا ہوں، اور وہ شام کو دفتر سے میری واپسی پر غالب اور ضبط تولید کے موضوع پر اپنے تازہ ترین الہامات کو مجھ پر نازل کرنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔

شام کو ظہور پذیر ہوتے تو غالب اور دوسرے شعراء کا موازنہ شروع فرما دیتے اور غالب کے منہ لگنے والے دیگر تمام شعراء کو گردن زدنی قرار دے کر بھی جب تسلی نہ ہوتی تو غالب کے مختلف شارحین کا پہلے سرکس پھر کشتی شروع کرا دیتے اور کافی دھر پٹخ کے بعد جب شارح کافی پست ہو چکتا تو خود بھی اکھاڑے میں کود پڑتے ہیں اور فرداً فرداً شارح کو پچھاڑتے اور پھر ہر شعر کے متعلق اپنی ایک انوکھی اچھوتی اور عجوبۂ روزگار شرح کا آغاز کر دیتے۔ جس کا انجام غالباً اس وقت تک نہ ہوتا جب تک میں اپنے ہوش و حواس کی قید و بند سے نجات پا کر وہاں نہ پہنچ جاتا جہاں سے خود مجھ کو میری خبر نہ آتی یعنی بالکل ہی بے سدھ ہو کر اپنے بستر پر گر نہ جاتا۔

میں اکثر خواب میں دیکھتا کہ حضرت غالب اپنا دیوان بغل میں دبائے بے تحاشہ چیختے ہوئے بھاگ رہے ہیں۔ "بچاؤ! بچاؤ! مجھے میرے شارحین اور ماہرین سے بچاؤ" اور ان کے پیچھے شارحین، ماہرین اور پرستاروں کا ایک غولِ بیابانی ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ جس کی قیادت ایک ڈنڈا لئے میرے محلے کے ماہر غالبیات کر رہے ہیں اور اپنے ساتھ مجھے بھی ایک زنجیر میں باندھے گھسیٹ رہے ہیں۔

کئی دنوں تکلف برطرف کر کے ان کی منت سماجت کی۔ ہاتھ جوڑے، داڑھی میں ہاتھ دیا، کان پکڑ کر اٹھا بیٹھا اور حرفِ مطلب یوں زبان پر لایا کہ اے ماہر غالبیات آپ کو آپ کے حضرت غالب مبارک! مجھ مغضوب کو میرے حال پر چھوڑ دیجئے تو آپ کی غالبیات میں کونسا بٹہ لگ جائے گا۔ میں ایک گدائے بے نوا ہوں، احمق، جاہل اور ہیچمدان ہوں میرے ایسے ذرہ ناچیز کو غالب ایسے آفتابِ عالم تاب

سے کیا نسبت ؟ میں حضرت غالب کا صرف اس قدر گنہگار ہوں کہ عالم طفولیت میں ایک مولوی صاحب نے اسکول میں کورس کی کتاب سے ان کی چند غزلیں زبردستی پڑھادی تھیں اس کے علاوہ مجھ سے قسم لے لیجئے جو میں نے کبھی انہیں ہاتھ بھی لگایا ہو۔ اور ہاتھ لگانا بھی خاک۔ ہاتھ آئیں تو ہاتھ لگائے نہ بنے ! غالب کو میں کیا میری سات پشتیں بھی نہیں سمجھ سکتیں میں نہ انہیں سمجھا ہوں اور نہ سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ آپ بے کار میرے ہوش وحواس پر چاند ماری گویا بنجر زمین میں تخم ریزی اور آبیاری کرتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ میں پاگل ہو جاؤں گا اور میرے بیوی بچے آپ کو اور مرزا غالب کو کوستے پھریں گے۔

لیکن ماہر غالبیات بھلا کب ماننے والے تھے میرے اظہار بیچارگی سے ان کی ہمہ دانی میں اور چار چاند لگ جاتے اور فخر وتمکنت سے ان کے گلے کی رگیں پہلے سے بھی زیادہ پھولنے لگتیں۔ ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے ؟ دے اور دل ان کو نہ دے مجھ کو زباں اور آپ غالب کو غلط سمجھے ہیں ! اے دریغا رند شاہد باز ! اور یہ فرمانے کے بعد ...... وہ غالب کے متعلق اپنی تحقیق اور دریافت کی گولہ باری مجھ پر کچھ اور تیز کر دیتے مجھے کبھی حواس باختہ دیکھتے تو چوکنا کرنے کے لئے مجھ پر دو چار انتہائی زلزلہ خیز سوالات داغ دیتے، غالب کے نظریۂ فلکیات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے اور اس کے ماتحت مذ تخشب کے ساتھ دستِ قضا نے کیا برتاؤ کیا ؟" غالب نے قدرتی مناظر سے جو نفسیاتی موشگافیاں کی ہیں اس سے ان کے تحت الشعور کی کس بلندی کا پتہ چلتا ہے ؟" غالب کے سماجی شعور میں سیاسی اور اقتصادی بلوغیت کب اور کیسے بڑھ ہوتی ؟ وغیرہ وغیرہ میں بھلا ان سوالات کا جواب کیا دیتا ؟ میں مجبوراً ماہر غالبیات کی طمانیت قلب کے لئے آنکھیں پھاڑ کر منہ کھول دیتا اور ان کی خواہش کے مطابق انہیں اپنے حیرت زدہ ہونے کا پورا پورا یقین دلا دیتا لیکن دل ہی دل میں سوچتا کہ اگر میں اپنی سماجی بلوغیت کو کام میں لاتے ہوئے اپنا ذہنی قلمدان ماہر غالبیات کے تحت الشعور پر پوری قوت سے پھینک دوں تو یقیناً ان پر فلکیات کے بہت سارے طبق روشن ہو جائیں گے

بس کیا عرض کیا جائے کہ کس طرح عاجز اور پریشان کر رکھا' ان ماہر غالبیات نے ان سے جان چھڑانے کے لئے بیسیوں ترکیبیں کیں محلے کے بااثر لوگوں کا دباؤ ڈلوایا۔ گمنام خطوط لکھے۔ ایک انسپکٹر پولس سے ان کے خلاف کوئی فرضی مقدمہ چلانے کی فرمائش کی' بیماری کا ڈھونگ بنایا۔ بہرے بنے (تو التفات دونا ہو گیا) دوستوں کے گھر جاکر پناہ لی۔ گھر کے دروازے بند کرلئے نوکر کو ہدایت کی کہ "ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے !" لیکن اجی توبہ کیجئے ...... اہل تدبیر کی واماندگیاں ! ماہر غالبیات مجھے نہ پاتے تو گھنٹوں غالب، کا کوئی شعر اور اس سے متعلق ایک نئی داستان ہوشربا اپنے اوپر طاری کئے ہوئے میرے دروازے کے سامنے گلی میں ٹہلا کرتے اور جب تک مجھے گھر جاتے یا گھر سے نکلتے گرفتار کرکے مجھ پر یہ شعر صادق نہ کر دیتے دم ہی نہ لیتے ؎

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

ان حالات میں چاہے اسے میری بد ذوقی کہئے چاہے اقدام قتل سے گریز کہ جیسے ہی مجھے ایک دوسرا مکان ملا جو اگرچہ میرے پہلے مکان کا صرف نصف بہتر معلوم ہوتا میں رسیاں تڑا کر بھاگا۔ ماہر غالبیات سے میں نے کہہ دیا کہ میں شہر کیا صوبہ چھوڑ رہا ہوں اور وہ مجھے آبدیدہ ہو کر رخصت کرنے آئے تو بڑے رقت انگیز لہجے میں فرمایا "آپ غالب کو غلط سمجھتے ہیں۔" اور اگر میں "شرم تم کو مگر نہیں آتی" نہ چیختا

اور غلطی سے تانگے والا اس کا مخاطب اپنے آپ کو سمجھ فوراً تانگہ ہانک نہ دیتا تو یقیناً ماہرِ غالبیات مجھے ایک فی البدیہہ وداعی جلاب دیئے بغیر ہرگز نہ مانتے۔

اپنے ان جان لیوا ماہرِ غالبیات سے چھٹکارا پاکر مجھے جو مسرت بے پایاں حاصل ہوئی اس کا اظہار غالباً غیر ضروری ہے۔ ع

مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

مکان تبدیل کرنے کے سلسلے میں اپنا ایک مکان سے انتہائی بدحواسی اور سراسیمگی سے باندھا ہوا سامان جب دوسرے مکان میں کھولا جاتا ہے تو کہیں سے لوٹ کر لائے گئے مالِ غنیمت کا لطف آجاتا اور اس میں ایسے ایسے حیرت انگیز انکشافات نمودار ہونے لگتے ہیں کہ ناطقہ سر بہ گریباں ہو کر رہ جاتا ہے میرا وہ آئینہ جس کو میں نے یقیناً کسی بہت محفوظ جگہ بڑی احتیاط سے چھپا دیا تھا کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے انتھک تلاش اور جستجو کے بعد بھی ہاتھ نہیں لگتا ہے لیکن نگار کا وہ جوتا جس کے متعلق کامل یقین تھا کہ دو مہینہ ہوئے کھو چکا ہے چنانچہ اس کے جوڑی دار کو میں نے چلتے چلاتے ماہرِ غالبیات کے مکان کی طرف اچھال دیا تھا ایک ڈبے سے بے ساختہ نکل پڑتے ہیں۔ میں نے اپنے سامان سے کشتی لڑ لڑ کر اس قسم کے حوادث سے دوچار تھا کہ دفعتاً کسی نے باہر کا دروازہ بھڑ بھڑانا شروع کر دیا۔ مجھے اس وقت سچ پوچھئے تو ملک الموت سے ملنے کی فرصت نہ تھی لیکن طوعاً و کرہاً لاحول پڑھتا ہوا لپکا اور دروازہ کھول دیا۔

داڑھی بڑھائے اور صرف بنیان اور تہمد پہنے ایک بزرگ نمودار ہوئے اور بڑی بے تکلفی سے سلام علیکم کہتے ہوئے بیٹھکے میں داخل ہو کر ایک کرسی گھسیٹی اور اس پر اکڑوں بیٹھ گئے اور کچھ جھوم کر یہ شعر پڑھا ؎

ہم پکاریں اور کھلے، یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا!

مجھے مجبوراً "وعلیکم السلام" کہہ کر ایک مونڈھے پر پناہ لینی پڑی۔

"اس مکان کے نئے کرایہ دار آپ ہی ہیں؟"

ع کوئی ویرانی سی ویرانی ہے؟ مطلب یہ کہ ع آئے نہ کیوں پسند ک ٹھنڈا مکان ہے!"

مرزا غالب کا تابڑ توڑ کلام سننے کے بعد غصے یا مستقبل کے خوف سے میرے کان خود بخود دہلنے لگے اور بڑی مشکل سے میرے م سے فقط ایک "جی" نکل سکی۔

ابھی ابھی مرزا کبن صاحب سے معلوم ہوا کہ یہاں تشریف لانے سے قبل آپ دہلی میں رہتے تھے۔

ع "کیوں نہ دلی میں ہر اک جیر نوابی نہ کرے"

"جی ہاں دو تین ماہ دلی میں بھی رہا ہوں۔ کیا میرے خلاف خفی پولیس کی کوئی تحقیقات آپ کے سپرد ہوئی ہے؟"

مسکرا کر چیخ اٹھے۔

ہے ہے خدانخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

میں نے ہمت کر کے دبی زبان میں عرض کیا "آپ نے ابھی تک مجھے خود اپنے آپ سے متعارف ہونے کا شرف نہیں بخشا۔"

اپنے سر کے بال نوچتے ہوئے بولے ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اب میری بدحواسی مکمل ہو چکی تھی "جی آپ؟ حضرت غال غا — !"

"جی ہاں حضرت غالب!" ع

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے مرا۔ میں اس

اور غلطی سے تانگے والا اس کا مخاطب اپنے آپ کو سمجھ فوراً تانگہ ہانک نہ دیتا تو یقیناً ماہرِ غالبیات مجھے ایک فی البدیہہ و دماغی جلاب دیئے بغیر ہرگز نہ مانتے۔

اپنے ان جان لیوا ماہرِ غالبیات سے چھٹکارا پاکر مجھے جو مسرت بے پایاں حاصل ہوئی اس کا اظہار غالباً غیر ضروری ہے۔ ع

مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

مکان تبدیل کرنے کے سلسلے میں اپنا ایک مکان سے انتہائی بدحواسی اور سراسیمگی سے باندھا ہوا سامان جب دوسرے مکان میں کھولا جاتا ہے تو کہیں سے لوٹ کر لائے گئے مالِ غنیمت کا لطف آجاتا اور اس میں ایسے ایسے حیرت انگیز انکشافات نمودار ہونے لگتے ہیں کہ ناطقہ سر بہ گریباں ہو کر رہ جاتا ہے میرا وہ آئینہ جس کو میں نے یقیناً کسی بہت محفوظ جگہ بڑی احتیاط سے چھپا دیا تھا کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے انتھک تلاش اور جستجو کے بعد بھی ہاتھ نہیں لگتا ہے لیکن نگار کا وہ جوتا جس کے متعلق کامل یقین تھا کہ دو مہینے ہوئے کھو چکا ہے چنانچہ اس کے جوڑی دار کو میں نے چلتے چلاتے ماہرِ غالبیات کے مکان کی طرف اچھال دیا تھا ایک ڈبے سے بے ساختہ نکل پڑتے ہیں۔ میں نے اپنے سامان سے کشتی لڑ لڑ کر اس قسم کے حادثات سے دوچار تھا کہ دفعتاً کسی نے باہر کا دروازہ بھڑ بھڑانا شروع کر دیا۔ مجھے اس وقت سچ پوچھئے تو ملک الموت سے ملنے کی فرصت نہ تھی لیکن طوعاً و کرہاً لاحول پڑھتا ہوا لپکا اور دروازہ کھول دیا۔

داڑھی بڑھائے اور صرف بنیان اور تہمد پہنے ایک بزرگ نمودار ہوئے اور بڑی بے تکلفی سے سلام علیکم کہتے ہوئے بیٹھکے میں داخل ہو کر ایک کرسی گھسیٹی اور اس پر اکڑوں بیٹھ گئے اور کچھ جھوم کر یہ شعر پڑھا ؎

ہم پکاریں اور کھلے ، یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا !

مجھے مجبوراً "وعلیکم السلام" کہہ کر ایک مونڈھے پر پناہ لینی پڑی۔

" اس مکان کے نئے کرایہ دار آپ ہی ہیں ؟ "

ع کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ، مطلب یہ کہ ع آئے نہ کیوں پسند ک[illegible] ٹھنڈا مکان ہے ! "

مرزا غالب کا تابڑ توڑ کلام سننے کے بعد غصے یا مستقبل کے خوف سے میرے کان خود بخود ہلنے لگے اور بڑی مشکل سے میرے م[illegible] سے فقط ایک "جی" نکل سکی۔

ابھی ابھی مرزا کبن صاحب سے معلوم ہوا کہ یہاں تشریف [illegible] لانے سے قبل آپ دہلی میں رہتے تھے۔

ع "کیوں نہ دلی میں ہر اک چیز نوابی نہ کرے "

"جی ہاں دو تین ماہ دلی میں بھی رہا ہوں۔ کیا میرے خلاف [illegible] پولیس کی کوئی تحقیقات آپ کے سپرد ہوئی ہے ؟ "

مسکرا کر چیخ اٹھے۔

ہے ہے خدانخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

میں نے ہمت کر کے دبی زبان میں عرض کیا " آپ نے ابھی تک مجھے خود اپنے آپ سے متعارف ہونے کا شرف نہیں بخشا۔"

اپنے سر کے بال نوچتے ہوئے بولے ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے ؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اب میری بدحواسی مکمل ہو چکی تھی " جی آپ ! حضرت غا[لب] غا ۔ ! "

" جی ہاں حضرت غالب ! ع

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے مرا۔ میں اس

وقت صرف یہ پوچھنے حاضر ہوا تھا کہ آپ دہلی میں رہتے ہیں تو شہنشاہِ اقلیم سخن حضرت غالب سے تو ضرور ہی واقف ہوں گے۔"

مجھے جھرجھری سی محسوس ہونے لگی اور میں نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا جی ہاں سنا ہے کہ اس نام کے ایک بزرگ کا مزار دہلی ہی میں ہے۔ اپنا سر پیٹتے ہوئے بولے۔ معاف کیجئے گا آپ نے بے رحمی کی حد کردی سنا ہے کہ اس نام کے ایک بزرگ کا مزار دہلی ہی میں ہے ع

جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

ابھی آپ کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ آپ اس بارگاہِ فلک منزلت پر ع رتبہ میں مہر و ماہ سے کم تر نہیں ہوں۔ سر عقیدت خم کرکے شرف قدم بوسی تو حاصل کر ہی لیتے۔ وہی مثل بارہ برس دہلی میں رہے اور ع سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر بھاڑ ہی جھونکتے رہے۔

میں نے بھی کچھ اس جھلاہٹ سے جواب دیا جیسے اگر میرا بس چلتا تو غالب کو ان کی خواہش کے مطابق غرق دریا ہو جانے دیتا۔ اور کچھ نہیں تو دہلی میں ان کا مزار ہرگز بننے نہ دیتا۔ میں مزار پر حاضر بھی ہوتا۔ تو مرحوم تو قبر کے اندر تھے نہ کہ اوپر، میں شرف قدمبوسی کیسے کر پاتا؟"

کلیجہ پکڑ کر بولے ہے ہے! ع رکھتے ہے ضد سے کھینچ کر باہر لگن میں پاؤں۔ ابھی آپ کو کیا خبر ؎

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہ طفلاں ہے
شرار سنگ نے تربت پہ میری گل فشانی کی

میں خاموش رہا چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر گویا ہوئے "کم سے کم ازراہ تعزیت آپ کو مرحوم کے بیوی بچوں کے پاس تو چلا ہی جانا چاہیے تھا۔ ع

بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور"

"اب کسی روز آپ کو ساتھ لیکر چلا جاؤں گا۔"

میرے جواب کو سنا ان سنا کرکے اچانک ہڑبڑائے اور میری کتابوں کے گٹھر پر جو ابھی میز پہ بے ترتیبی سے رکھا ہوا تھا جھپٹے اور سب سے اوپر کی کتاب جو اتفاق سے دیوانِ غالب تھی اٹھا کر "جوش بہار جلوہ" بنتے ہوئے بولے "یہ صحیفہ آپ کو کہاں سے دستیاب ہوا۔ ع یادگار نالہ اک دیوان بے شیرازہ تھا۔ مدت کے بعد آج ایک مسلم دیوانِ غالب ہاتھ آیا ہے جو کسی طرح بھی مجھے مرغ مسلم سے کم عزیز نہیں۔ ع کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

"بازار سے"

"بازار سے؟" اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا! کیا بازار میں اس قسم کا کلام بھی بکتا ہے؟ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سترہ اٹھارہ سال ہوئے میرے پاس بھی ایک مسلم دیوان غالب تھا جو میرے رشتہ دار کے ایک نانا میرے گھر پر بھول گئے تھے۔ ع کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا لیکن خوش قسمتی سے ایک روز برخوردار جمن کی والدہ جو آگ جلانے بیٹھیں ع کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔ تو اس صحیفہ زرین کو کچھ اس طرح پھاڑا کہ بس ع دل سے تیری نگاہ جگر تک اتر گئی۔ یعنی دیوان کا قریب قریب ہر مصرعہ اولیٰ اپنے مصرع ثانی سے جدا ہو گیا۔ وہ تو کہئے کہ بروقت میری نظر پڑ گئی ورنہ ع آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا۔ کا مضمون درپیش آجاتا۔ کیوں صاحب یہ لفظ خوش قسمتی پر آپ چونکے کیوں؟ جی ہاں ع اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا!"

میں نے اپنا پیٹ پکڑتے اور منہ بناتے ہوئے عرض کیا۔ اس وقت پیٹ میں کچھ درد ہو رہا ہے۔ اگر یہ گفتگو آپ کسی دوسرے وقت کے لئے ملتوی کر دیں ......"

نادرشاہی حکم دیا ؎

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

جی ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ اب جو والدہ محترمہ مطلب یہ کہ جمن کی والدہ محترمہ ان اوراق پریشاں کو جو کسی عاشق کا گریباں ہو چکے تھے جوڑنے بیٹھیں تو ان کو کچھ ایسا جوڑ دیا کہ فن غالبیات میں ایک نئے دور کا آغاز بلکہ اضافہ ہو گیا اور جس پر ناچیز اپنی عمر عزیز کے بارہ سال صرف کر چکا ہے اور اب بہت جلد دیوانِ غالب حسب ترتیب بالغ منظرِ عام پر جلوہ افروز ہو کر مشتاقانِ غالب اور قدر شناسانِ بالغ کے لئے جنت نگاہ اور فردوس گوش بننے والا ہے محض مصرعوں کی تھوڑی سی الٹ پلٹ سے کلام کی لطافت، ظرافت اور صداقت نہیں معلوم کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی ہے اور یقیناً آپ مرزا غالب کو فرمانے کا غ نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی۔ کوئی حق باقی نہیں رہتا ہے۔ کاش کہ وہ خود اس کو دیکھتے تو غش غش کر کے کفِ افسوس ملتے کہ ہائے خود مجھے یہ کیوں نہ سوجھی اور بلا امداد بالغ میں نے یہ پہیلی کیوں نہ بوجھی۔"

سلسلہ کلام ایک طرح کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں دیکھئے کس طرح دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے؟ ایک روز مجنوں اسکول سے روتا ہوا لوٹا تو اس نے اپنے گارجین مرزا غالب سے شکایت کی کہ اسکو ماسٹر نے بے قصور مارا ہے۔ مرزا غالب کا افراسیابی خون جوش میں آگیا اور وہ ماسٹر کے پرخچے اڑانے اسکول پہنچے تو عین موقع واردات پر شاعر مل گیا۔ اور وہ انھیں سمجھاتا ہے کہ ماسٹر نے برخوردار مجنوں کو جو سزا دی وہ بالکل حق بجانب تھی کیونکہ یہ صاحبزادے کوئلہ سے اسکول کے دیوار خراب کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔"

نہ لٹتا صبح سے غالب کیا ہوا گر اسنے شدت کی
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

ذرا خدا لگتی کہئے کہ اب شعر کی اخلاقی حیثیت کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے عاشق کی عزت نفس کے متعلق غالب نے بہت سے اشعار کہے ہیں لیکن خدارا اس شعر کے تیور ملاحظہ فرمائیے۔ ایک کلرک ہو جانے کے بعد عاشق کے لہجے میں کیسی خود اعتمادی آجاتی ہے ؎

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

کون کہتا ہے کہ مرزا صاحب نا عاقبت اندیش تھے۔ دیکھئے کس طرح اپنے بھتیجے بھائی اسد کو مشورہ لینے کے بہانے نصیحت کرتے ہیں ؎

لے تو لوں سوتے میں اسکے پاؤں کا بوسہ مگر
فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد

اور غالباً یہ آپ کے مذاق کا شعر ہو۔ ذرا معشوق کی جلد بازی تو ملاحظہ فرمائیے ؎

زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

اور معشوق کی تیز رفتاری تو غالباً اس سے بہتر کبھی بیان ہی نہیں کی جاسکتی ؎

تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا
کس نے کھولا، کب کھلا، کیونکر کھلا

اور غالباً یہ شعر تو داد سے مستغنی ہے۔ ساقی اس سے بڑھ کر مرزا صاحب پر اور احسان ہی کیا کر سکتا تھا۔

میں حظِ وصل خدا ساز بات ہے
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اور پھر معشوق کے بڑھاپے کی جب وہ کسی بچوں کی ماں بن کر اپنے شوہر یعنی غالب کے پرانے رقیب کے ساتھ سب خیریت ہے، قسم کی زندگی بسر کر رہی ہے، کیا خوب تصویر کھینچ کر

رکھدی ہے ؎

یقیں ہے ہم کو بھی، لیکن اب اس میں دم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

دیکھئے ع۔ ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد! یہ سب مصرعے حضرت غالب ہی کے ہیں۔ اور میں نے ان میں کسی قسم کی کوئی تحریف نہیں کی ہے۔ صرف ذرا چابکدستی سے ان کی ترتیب میں تھوڑی سی الٹ پلٹ کر دی ہے۔

میں نقش حیرت بنا یہ سب سن رہا تھا لیکن نہیں معلوم میرے ہاتھوں میں ایک خاص قسم کی تشنجی کیفیت کیوں پیدا ہو رہی تھی۔

بالغ صاحب کی روانیٔ طبع کچھ اور تیز ہو چلی: "دیکھئے مرزا صاحب معشوق کو بہلا پھسلا کر اسے چھپ چھپ کر ملنے کے کیسے کیسے مقامات بتاتے ہیں۔ گرگِ باراں دیدہ تھے کہ نہیں! ؎

مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

اس کے بعد کیا ہوا؟ تفصیلات برطرف۔ ایک تہمد اور ایک بنیان کی کچھ دھجیاں میرے حصے میں آئیں۔ اور میرا پرانا رفیق دیوانِ غالب مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا فی الحال ہسپتال میں ہوں اور بیوی بچے ہوٹل میں۔ الاٹمنٹ افسر کو درخواست دے رکھی ہے کہ مجھے کوئی ایسا مکان الاٹ کیجیے جس میں چاہے روشن دان، نابدان بلکہ چھتیں اور دیواریں تک نہ ہوں لیکن اس کے ایک میل کے قطر میں کوئی ماہر غالبیات نہ پایا جاتا ہو۔ ابھی تک تو کوئی ایسا مکان نہیں مل پایا ہے۔

واضح رہے کہ غالب اب بھی میرا محبوب ترین شاعر ہے بلکہ ماہرین و شارحین کے ہاتھوں اس کی درگت بنتے دیکھ کر وہ مجھے پہلے سے بھی کہیں زیادہ عزیز ہو گیا ہے۔ بحمداللہ میں نے دیوان غالب کا ایک نسخہ خرید لیا ہے۔ اور غسل خانے میں جب بھی پانی ضرورت سے زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے تو اس کے اور صرف اس کے اشعار گنگنایا کرتا ہوں اور اکثر اس کی مظلومیت کا تصور کر کے یہ مصرعہ بھی پڑھ لیتا ہوں ؎

شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

●●

بقیہ سلسلہ ص ۴۶

اشیائے خوردنی کے نرخ ایک خوبصورت پمفلٹ کی شکل میں آپ کے سامنے آجائیں گے جن کو پڑھ کر اور جیب ٹٹولنے کے بعد آپ یہی چاہیں گے کہ اس رستوران کے اندر کے ماحول کی ہوا کھا کر ہی وہاں سے باہر نکل آئیں۔

جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو کیا کرے کوئی

ہندوستان میں گداگری کے اچھوتے طریقے ہیں سر بھی بیٹا جاتا ہے اور پیٹ بھی۔ اس ورزش سے اگر ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھیر گانا شروع کر دو۔ "ڈگ آواز کے جھٹکے سے ہی پل جائیں گے"۔ اور اگر آواز اچھی نہیں تو دعا اختیار کیجیے یا محض دردناک آوازیں لگائیے۔ ہندوستانی شرفا گداگروں کے پہچاننے میں ذرا بھی دشواری محسوس نہیں کرتے۔

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اگر بنتے آکر قبرستان میں نہ پہنچ گئے ہوتے تو "حرام خوری" کی پاداش میں جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے ضرور ہوتے

مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھئے

تم مکمل کیفیت اور تجویز لکھ کر لے آؤ میں نیچے خوبصورت دستخط بٹھا دوں گا۔

●●●

شاہ فیاض عالم (ڈرامہ)

دیوان غالب صاحب

افراد

دیوان غالب :- یہ غالب کے کلام کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک عجیب و غریب شخص ہے غالب کا شیدائی، اس کے کلام کا حافظ، غالب کا کلام اس کا اوڑھنا بچھونا، نثر میں بات کرنا تو گویا جانتا ہی نہیں، ہر بات غالب کے شعر میں کرتا ہے۔ اسی لئے دیوان غالب کہلاتا ہے۔

حکیم صاحب :- دیوان غالب کے ایک پرانے دوست

وکیل صاحب :- دیوان غالب کے ایک نئے دوست

مولوی صاحب :- دیوانی وکیل، مے فروش، پولس انسپکٹر

مجسٹریٹ، سرکاری وکیل

سپاہی، سنتری وغیرہ

پہلا منظر

پردہ اٹھتا ہے

دیوان غالب فقیرانہ لباس میں، اس طرح کھڑے ہیں کہ ان کا آدھا چہرہ نظر آرہا ہے ان کی نگاہیں غالب کی تصویروں کا جائزہ لے رہی ہیں۔ فرشی نشست کا سامان ہے۔ ایک قالین دو تکیے۔ ایک تپائی رکھی ہے۔ اس پر دیوان غالب کی کئی جلدیں اور اس کی شرح میں رکھی ہوئی ہیں۔

دیوان غالب (تصویروں کی طرف مخاطب ہو کر)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

(پھر وہاں سے چل کر قالین پر آجاتے ہیں اور چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے افسردہ ہو کر)

کاو کاو سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

نوکر :- (آداب بجا لا کر) حضور میں صدیقی صاحب کے یہاں گیا تھا انھوں نے فرمایا ہے کہ میں آج حاضر نہ ہو سکوں گا۔ بہت مصروف ہوں۔

دیوان غالب :- یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

(نوکر واپس چلا جاتا ہے۔ پھر فوراً ہی داخل ہوتا ہے)

نوکر :- حکیم صاحب تشریف لائے ہیں۔ اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں

دیوان غالب :- وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔

(حکیم صاحب لکھنوی لباس میں داخل ہوتے ہیں اور جھک کر سلام کرتے ہیں)

(حکیم صاحب کی طرف مخاطب ہو کر)

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو
ریزش سجدۂ جبین نیاز

(حکیم صاحب بیٹھ جاتے ہیں۔)

نوکر :- وکیل صاحب تشریف لائے ہیں۔

دیوان غالب :- کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے

(وکیل صاحب اسٹیج پر نمودار ہوتے ہیں)

کہ غیر جلوۂ گل رہ گزر میں خاک نہیں

وکیل صاحب :- (کوٹ پتلون پہنے نشست کے قریب آجاتے ہیں حکیم صاحب اور دیوان غالب کھڑے ہو جاتے ہیں)
"السلام علیکم"

دیوان غالب :- تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

حکیم صاحب :- وعلیکم السلام۔ آیئے وکیل صاحب تشریف لایئے۔ کہئے کیسے حال چال ہیں۔؟

وکیل صاحب :- بالکل ٹھیک ہے۔ دعا چاہئے۔ آپ کی (دیوان غالب کی طرف مخاطب ہو کر) ماشاءاللہ اب تو آپ بھلے چنگے دکھائی دے رہے ہیں۔

دیوان غالب :- ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

حکیم صاحب :- کیوں کیسی طبیعت ہے آپ کی۔؟

دیوان غالب :- قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا
خوں بھی ذوق درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

وکیل صاحب :- کیا اب تک کمزوری باقی ہے۔؟

دیوان غالب :- ضعف سے اے گریہ! کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں
ہو فشار ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

وکیل صاحب :- کیوں علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا؟

دیوان غالب :- درد منت کش دوا نہ ہوا۔
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

حکیم صاحب :- اچھا تو یہ فرمایئے آپ کو نیند تو اچھی طرح آتی ہے۔

دیوان غالب :- نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

وکیل صاحب :- دیوان غالب صاحب! آپ نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔؟ آپ صاحب ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ فقیرانہ وضع اختیار کرلیں۔

دیوان غالب :- بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر :- مولانا خیرالزماں صاحب تشریف لائے ہیں۔

دیوان غالب :- حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

حکیم صاحب :- جاؤ ان کو اندر لے آؤ

(مولوی خیرالزماں صاحب بڑا سا عمامہ، باندھے لمبا سا چغہ پہنے اور کندھے پر رومال ڈالے داخل ہوتے ہیں اور سب کو سلام کر کے خالی جگہ پہ بیٹھ جاتے ہیں۔)

مولوی صاحب :- دیوان غالب صاحب آجکل آپ کیا کر رہے ہیں۔؟ بیکار کب تک رہئے گا۔؟ مستقبل کے لئے کوئی فیصلہ کیا ہے یا نہیں؟ کیا سوچا ہے آپ نے؟

دیوان غالب :- کوئی دن گر زندگانی اور ہے۔
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے۔

حکیم صاحب :- آپ نے پچھلے ماہ کوارٹر کے لئے جو درخواست دی تھی اس کا کیا رہا۔؟
کوارٹر ملنے کی کوئی امید ہے؟

دیوان غالب :- (ٹھنڈی آہ بھر کر)
کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

وکیل صاحب :- آپ اطمینان رکھئے ہم جلد ہی آپ کو اچھا سا فلیٹ دلوادیں گے۔

دیوان غالب :- ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

وکیل صاحب :- مگر وہ کوارٹر جو حکومت آپ کو دے گی بالکل بے کار ہے۔

دیوان غالب :- ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

(مولوی صاحب سر جھکائے خاموش کسی سوچ میں بیٹھے ہیں۔ اور تھوڑی دیر بعد ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں)

دیوان غالب:۔ (مولوی صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر)
دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے۔
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

مولوی صاحب:۔ میں خود مکان کی تلاش میں ہوں مگر کہیں کوئی کوارٹر یا فلیٹ ملتا ہی نہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ کہاں چلیں کر رہا جائے۔

دیوان غالب:۔ رہئیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مولوی صاحب:۔ حکیم صاحب کوئی دوا دیجئے۔ میرا تو فکر کے مارے برا حال ہوگیا۔ ایک ماہ سے رات بھر نیند نہیں آتی۔

دیوان غالب:۔ موت کا ایک دن معین ہے۔
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی۔

حکیم صاحب:۔ بہت بہتر، کسی روز مطب میں تشریف لائیے نسخہ لکھ دوں گا۔

دیوان غالب:۔ نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا۔
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے۔

مولوی صاحب:۔ (چھیڑنے کے انداز میں) آخر یہ آپ کو کیا ہوگیا ہے جب دیکھئے غالب کے اشعار پڑھتے رہتے ہیں۔ آخر آپ کو غالب سے اس قدر عشق کیوں ہے؟۔ غالب میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں وہ ایک شاعر تھا اور مے نوش، بے عمل، زمانہ ساز۔ لیکن آپ ہیں کہ اس کے کلام کو حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں۔

دیوان غالب (غصہ میں تن کر)
یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے
غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

مولوی صاحب:۔ آخر غالب نے اپنی زندگی میں کون سے ایسے کارنامے کئے ہیں جو انسانیت کے لئے مفید ہوں۔ وہ ایک بے فکر آدمی تھا۔ سوائے شاعری کے اس میں اور خوبی ہی کیا تھی؟

دیوان غالب:۔ کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہئے

مولوی صاحب:۔ دنیا میں شاعروں کی کمی نہیں۔ آخر آپ غالب ہی کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑے ہیں۔

دیوان غالب:۔ ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

مولوی صاحب:۔ آپ نے تو غالب کو اپنا پیر و مرشد بنا لیا ہے۔ آخر اس میں ایسی کون سی خصوصیت ہے؟

دیوان غالب:۔ یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مولوی صاحب:۔ مانا کہ غالب کے اشعار میں کہیں کہیں تصوف کی باتیں بھی مل جاتی ہیں۔ مگر بسا اوقات تو وہ کفر بکنے لگتا ہے۔

دیوان غالب:۔ دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

مولوی صاحب:۔ میری سمجھ میں تو آپ کی بات نہیں آتی۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ایک شخص کسی شاعر کا معتقد ہو تو اس کے کلام کو اوڑھنا بچھونا بنا لے اور ہر موقع پر اس کے اشعار پڑھا کرے۔

دیوان غالب:۔ یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

(دیوان غالب تڑپ کر اٹھتا ہے اور غالب کی بڑی تصویر سے خطاب کرتا ہے)

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے
(اور پھر اسی طرف رخ کئے کھڑا رہتا ہے)

حکیم صاحب:۔ اجی دیوان غالب صاحب تشریف لائیے۔

مولوی صاحب:۔ دیوان غالب صاحب میں بہت شرمندہ ہوں۔ میرے الفاظ سے آپ کے جذبات کو ٹھیس لگی ہے۔ براہ کرم معاف کر دیجئے۔

دیوان غالب:۔ (ذرا ٹھنڈے ہو کر)
نہ ڈر ناصح سے غالب کیا ہوا اگر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر
(گریبان کو اس طرح کھینچتے ہوئے گویا اب پھاڑ ڈالیں گے واپس آتے ہیں اور اپنی جگہ آکر بیٹھ جاتے ہیں)

حکیم صاحب :- (موضوع بدل کر) دیوان غالب صاحب فرمایئے۔ اب آپ کو اپنا کلکتہ بھی یاد آتا ہے۔ اس کی گلیوں، اس کی سرگمیں اور وہاں کے دل فریب مناظر۔

دیوان غالب :- (کیف و سرمستی کے عالم میں)

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ وہ شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

(دیوان غالب بیخودی کے عالم میں مسلسل جھومتے اور ہائے ہائے کرجاتے ہیں)

حکیم صاحب :- اوہ معلوم ہوتا ہے کہ دورہ پڑ گیا ہے ان پر نوکر کو بلاؤ (نوکر داخل ہوتا ہے اور دیوان غالب کا یہ حال دیکھ کر بھاگا جاتا ہے اور شراب کی بوتل اور گلاس لئے ہوئے آتا ہے۔ ایک گلاس بھر کر دیوان غالب کے منھ سے لگا دیتا ہے جس کو دیوان غالب ایک ہی سانس میں پی جاتا ہے۔ پھر قدرے ہوش آجاتا ہے۔ مولوی صاحب کو شراب کی بو آتی ہے وہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں)

دیوان غالب :- (مستی کے عالم میں ہاتھ بڑھا کر اور شراب مانگتے ہیں)

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

(نوکر ایک گلاس اور بھر کر دیتا ہے۔ گلاس ہاتھ میں لے کر خوش ہوکر مستی کے عالم میں)

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

اور خالی گلاس مولوی صاحب کے پاس رکھ دیتا ہے۔

مولوی صاحب :- یک بیک پیچھے ہٹ کر استغفراللہ آپ شراب پیتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ تمام مہاجرین کا کیا حال ہے ان کو پیٹ بھرنے کے لئے روٹی اور تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا میسر نہیں اور آپ شراب سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

دیوان غالب :- مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

وکیل صاحب :- اچھا اب پتہ چلا کہ آپ شراب کیوں پیتے ہیں اس بیخودی کے پردے میں کوئی گہرا راز پنہاں ہے۔

دیوان غالب :- (مسکرا کر)

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

حکیم صاحب :- ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ گہرا معاملہ بھی کچھ عشق وغیرہ سے متعلق معلوم ہوتا ہے۔

دیوان غالب :- کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

حکیم صاحب :- دیکھئے دیوان غالب صاحب! شراب کی بدولت آپ کی یہ حالت ہوئی بہتر ہے کہ آپ شراب سے توبہ کرلیں۔

دیوان غالب :- یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

وکیل صاحب :- آپ شراب پیتے ہیں وہ بھی قرض کی۔ دیوان غالب صاحب! یہ مشغلہ ترک کر دیجئے ورنہ دفعہ ۳۱۲ کے تحت دو سال کے لئے دھر لئے جائیں گے۔ کیوں اپنے ہاتھوں اپنا گھر برباد کرتے ہیں۔

دیوان غالب :- نقصان نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

مولوی صاحب :- آپ کو اپنے گھر کے خراب ہونے کی پروا نہیں ہے۔ لیکن اپنی عاقبت کیوں خراب کرتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ مے خواروں کے لئے جنت میں کوئی جگہ نہ ہوگی۔

دیوان غالب :- ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مولوی صاحب :- اور آپ اس غمِ عشق ہی سے کیوں نہ کنارہ کش ہوجائیں جس نے آپ کو مے نوشی پر مجبور کیا ہے۔

دیوان غالب :- غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
(ذرا رک کر) عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

(نوکر خط لاتا ہے اور دیوان غالب کو دیکھ کر وہ ان کو دیکھتا رہتا ہے۔)

دیوان غالب :- (خط لے کر بہت خوش ہو کر)
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبی، عنوان کیے ہوئے
(خط لے کر پڑھتے ہیں)
وکیل صاحب :- "کہیے کیا لکھا ہے خط میں؟"
دیوان غالب :- ایک جا حرف وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے
(نوکر کی طرف دیکھ کر)
دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغام زبانی اور ہے
نوکر :- حضور انھوں نے کہا ہے کہ پرسوں شام کو آرام باغ کی سیر کو چلیں گے آپ بھی پانچ بجے آجائیے۔
دیوان غالب :- وعدہ سیر گلستاں ہے خوشا طالع شوق
مژدہ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں
(اتنے میں ایک اور صاحب آکر بیٹھ جاتے ہیں)
حکیم صاحب :- بھئی واہ خوب موقع سے تشریف لائے آپ
بھئی اس خوشی کے موقع پر تو غالب کی کوئی چیز ہو جائے
وکیل صاحب :- ہاں ہاں! ضرور ضرور!!
دیوان غالب :- (اس شخص کی طرف مخاطب ہو کر)
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا
وہ شخص :- ترنم سے غالب کی غزل پڑھتا ہے۔
ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند؟
کس کی حاجت روا کرے کوئی؟
کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی.؟
جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی
(غزل ختم ہوتی ہے۔ اتنے میں نوکر گھبرایا اندر داخل ہوتا ہے۔)
نوکر :- صاحب وہ دکاندار سپاہیوں کو لے کر آیا ہے خدا جانے کیا بات ہے۔"
وکیل صاحب :- "یہاں بھیج دو ان سب کو۔"
(مے فروش ڈگری لئے سپاہیوں اور انسپکٹر کے ساتھ داخل ہوتا ہے)
مے فروش :- (دیوان غالب کی طرف اشارہ کر کے) "یہ ہیں صاحب وہ"
انسپکٹر :- آگے بڑھ کر وارنٹ دکھاتے ہوئے) میں آپ کو دفعہ ۳۱۲ کے تحت گرفتار کرتا ہوں۔
مولوی صاحب :- ارے کیا بات ہے کچھ بتاؤ تو سہی
مے فروش :- (دیوان غالب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ ان ہی سے پوچھ لیجئے۔
(مولوی صاحب :- متفسرانہ انداز میں دیوان غالب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں)
دیوان غالب :- (نہایت ہی یاس بھرے لہجے میں)
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
مے فروش :- ہمیں ان سے کوئی دشمنی تو نہیں ہے ہم کو تو اپنی رقم وصول کرنی ہے۔
ہم تو انہیں اپنا دوست سمجھ کر سالہا سال سے شراب قرض دیتے رہے۔
دیوان غالب :- یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو
(سپاہی دیوان غالب کو لے کر چلتے ہیں)
نوکر :- (رو کر) حضور ہمیں کس پر چھوڑ جاتے ہیں؟
حکیم صاحب :- "ہائے دیوان غالب صاحب! آپ نے ہمارا کہنا نہیں مانا اور معاملہ یہاں تک پہنچا۔"
وکیل صاحب :- ہائے آپ کے بغیر تو ہماری محفلیں سونی ہو جائیں گی
دیوان غالب :- غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

دوسرا منظر

(سپاہی دیوان غالب کو ننگے پاؤں اپنی حراست میں لئے جاتے ہیں۔ پیچھے پیچھے دیوان غالب کے تینوں دوست سر جھکائے چلے آتے ہیں)

دیوان غالب :۔ ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

(تمام لوگ اسٹیج کے دائیں کونے پر آکر غائب ہو جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے مگر پھر فوراً ہی اٹھ جاتا ہے۔ منظر میں کوئی کوئی تبدیلی نہیں۔ سپاہی مع قیدی دائیں کونے سے نکلتے ہیں مگر وکیل صاحب نظر نہیں آتے)

سپاہی :۔ (ڈانٹ کر) "جلدی جلدی چل"

دیوان غالب :۔ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں۔

(تمام لوگ اسٹیج کے بائیں کونے میں غائب ہو جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے دوسرے ہی لمحہ پھر اٹھ جاتا ہے۔ اس دفعہ مولوی صاحب اور حکیم صاحب بھی غائب ہو جاتے ہیں۔

دیوان غالب :۔ (ایک دم پیچھے گھوم کر دیکھتا ہے۔)
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

(راستے میں دیوان غالب کا ایک اور دوست مل جاتا ہے)

دوست :۔ ارے یہ کیا معاملہ ہے ؟

دیوان غالب :۔ پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

دوست :۔ اب کہاں جا رہے ہو ؟

دیوان غالب :۔ لے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

تیسرا منظر

(تھانے میں تھانیدار صاحب ایک کرسی پر بیٹھے ہیں۔ سامنے میز پر کچھ فائل، کاغذات رجسٹر اور لکھنے پڑھنے کا سامان رکھا ہے وہ لکھنے میں مصروف ہیں کہ سپاہی دیوان غالب کو لے کر حاضر ہوتے ہیں۔)

تھانیدار :۔ دیوان غالب کو گھور کر سپاہیوں سے مخاطب (ہو کر) "اچھا یہی ہے دیوان غالب، بہت ہی برا آدمی معلوم ہوتا ہے

دیوان غالب :۔ لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

تھانیدار :۔ (سپاہیوں سے لے جاؤ اس کو حوالات میں بند کر دو، چند دنوں میں حوالات کی ہوا کھا کر حضرت کے مزاج درست ہو جائیں گے۔)

(سپاہی دیوان غالب کو لے چلتے ہیں۔ تھوڑے فاصلہ پر دیوان غالب تھانیدار کی طرف منہ کر کے)

دیوان غالب :۔ گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

(تھانیدار سن لیتا ہے اور غصہ میں کرسی سے اٹھ کر دیوان غالب کے پاس آتا ہے)

تھانیدار :۔ یہ کیا بکتے ہو جی تم ؟

دیوان غالب :۔ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

تھانیدار :۔ ابھی تم نے مجھے کیا کہا تھا۔

دیوان غالب :۔ روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

تھانیدار :۔ تم بڑے بدطینت آدمی معلوم ہوتے ہو۔

دیوان غالب :۔ قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

(تھانیدار مطمئن ہو کر چلا جاتا ہے)

دیوان غالب :۔ (تھانیدار کی طرف منہ کر کے)
دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

چوتھا منظر

(حوالات کی سلاخوں کی دوسری طرف دیوان غالب کھڑے ہیں سنتری بندوق کاندھے پر رکھ کر پہرہ دے رہا ہے۔ حکیم صاحب آتے ہیں۔ دیوان غالب کو اشارے سے سلام کرتے ہیں۔ دیوان غالب بھی اشارے سے جواب دیتے ہیں۔ حکیم صاحب مصافحہ کے

لیے ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ دیوان غالب بھی اپنا ہاتھ سلاخوں سے باہر نکالتے ہیں اور مصافحہ کرتے ہیں۔)

حکیم صاحب:۔ دیوان غالب صاحب آپ کے آنے کے بعد کیا بتاؤں کہ آپ کے گھر کا کیا حال ہوگیا ہے (کہتے کہتے رک جاتے ہیں)

دیوان غالب:۔

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

حکیم صاحب:۔ آپ کیا چلے کہ گھر ویران ہوگیا اور ہماری بزم کی تو رونق ہی ختم ہوگئی۔

دیوان غالب:۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

حکیم صاحب:۔ کہئے یہاں کیا حال ہے آپ کا۔ جی تو بہت گھبراتا ہوگا۔

دیوان غالب:۔

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا
بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

حکیم صاحب:۔ آپ کو یہاں زیادہ تکلیف تو نہیں؟

دیوان غالب:۔ قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گراں باری زنجیر بھی تھا

(یکبارگی دیوان غالب کی آنکھیں اشک آلود ہوجاتی ہیں اور وہ دامن سے آنسو پونچھنے لگتے ہیں)

حکیم صاحب:۔ آپ روتے کیوں ہیں؟

دیوان غالب:۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

حکیم صاحب:۔ لیکن اگر آپ اسی طرح روتے رہے تو آپ کا حال اور برا ہوجائے گا۔

دیوان غالب:۔

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

حکیم صاحب:۔ اچھا دیوان غالب صاحب آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔

دیوان غالب:۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

(سپاہی آتا ہے)

سپاہی:۔ تمہارے مقدمہ کی تاریخ ۲۱ اپریل پڑی ہے۔ اس دن تمہیں عدالت میں چلنا ہوگا۔

دیوان غالب:۔ مہرباں ہوکے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

(سپاہی واپس چلا جاتا ہے۔ حکیم صاحب دیوان غالب سے ہاتھ ملا کر چل رہے ہیں)

دیوان غالب:۔ زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پانچواں اور آخری منظر

(عدالت کا منظر۔ جج ایک اونچی کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ سامنے ایک میز ہے۔ اس پر ضروری کاغذات فائل وغیرہ ہیں۔ ایک ہتھوڑا بھی رکھا ہوا ہے۔ جج کی میز کے پاس ہی کلرک بیٹھا ہے۔ اس کے پاس بھی کاغذات ہیں۔ سرکاری وکیل اور دیوان غالب کے احباب اور ان کا ملازم بھی عدالت میں موجود ہیں۔ دیوان غالب کٹہرے میں کھڑے ہیں۔

دیوان غالب:۔

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز
گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے

جج:۔ تھانیدار اپنی رپورٹ پیش کرے

تھانیدار:۔ (ملزم کی طرف اشارہ کرکے) یہ ہیں وہ صاحب جو مدتوں سے سالہا سال سے شراب قرض لے کر پیتے رہے ہیں۔ جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ دس روپے روزانہ صرف شراب کا خرچ تھا۔ اصل نام کسی کو معلوم نہیں۔ بس دیوان غالب کے نام سے آپ کو مشہور کر رکھا ہے بات کبھی نظم میں نہیں کرتے ہر بات کے جواب میں غالب ہی کے اشعار

پیش کرتے ہیں۔ کلکتہ سے فسادات کے دوران میں یہاں آکر آباد ہو گئے
کچھ کام کرتے نہیں۔ خالی بیٹھے یا تو دن بھر شراب پیتے رہتے ہیں۔ یا دوستوں
کو جمع کر کے دیہا چوکڑی مچاتے ہیں (انسپکٹر واپس چلا جاتا ہے اور سرکاری
وکیل اٹھ کر ملزم سے سوال کرتا ہے)

سرکاری وکیل :- (ملزم سے مخاطب ہو کر) تمہارا نام کیا ہے؟
کہاں رہتے ہو اور کیا کام کرتے ہو۔؟

دیوان غالب :- ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

سرکاری وکیل :- اچھا میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں —
براہ کرم یہ بتایئے کہ آپ کون ہیں اور آپ کا نام کیا ہے۔؟

دیوان غالب :- پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

سرکاری وکیل :- آپ کا گھر کہاں ہے؟

دیوان غالب :- گھر جب بنا لیا ہے ترے در پہ کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

سرکاری وکیل :- آپ بھی خوب آدمی ہیں۔ مانا کہ آپ کا..
موجودہ گھر تو حوالات ہی ہے لیکن اس سے پہلے بھی آپ کا کہیں گھر
تھا یا نہیں؟"

دیوان غالب :- خانۂ مجنوں صحرا گرد بے دروازہ تھا۔

سرکاری وکیل :- خیر گھر کا پتہ تو لگ ہی جائے گا۔ لیکن اپنا
پیشہ تو بتایئے۔؟

دیوان غالب :- سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

سرکاری وکیل :- خیر یہ تو آپ کے آباد کا پیشہ رہا ہوگا۔
لیکن آپ کیا کام کرتے ہیں؟

دیوان غالب :- عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

سرکاری وکیل :- آپ پر یہ الزامات عائد کئے گئے ہیں کیا
آپ کو ان کی صحت کا اقرار ہے۔

دیوان غالب :- کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے

سرکاری وکیل :- دیوان غالب کے جوابات سن کر غصہ میں
ٹہلتا ہے، پھر جج سے مخاطب ہو کر) "می لارڈ! یہ عجیب بے وقوف
قسم کا آدمی ہے گتنے بے تکے جواب دے رہا ہے۔ یہ تو پاگل ہے یا ہم سب
کو پاگل بنانا چاہتا ہے۔ می لارڈ! اس ملزم کو خاطر خواہ سزا ملنی
چاہئے۔ یہ نثر میں بولتا ہی نہیں بے معنی اشعار جواب میں پڑھ ڈالتا ہے

دیوان غالب :- نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

جج :- (میز پر ہتھوڑا بجاتا ہے) آرڈر! آرڈر! ملزم زبان
سنبھال کر بات کرو۔ یہ کمرہ عدالت ہے محفل مشاعرہ نہیں۔

دیوان غالب :-
قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجان گلشن کو

سرکاری وکیل :- می لارڈ! یہ ملزم بہت ہی خطرناک قسم
کا آدمی ہے اس نے مدعی کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ مدعی اس کو
شریف سمجھ کر شراب قرض دیتا رہا۔ یہاں تک کہ کئی سال گزر گئے
اور ایک کثیر رقم ملزم پر چڑھ گئی۔ مدعی نے عدالت سے چارہ جوئی کی۔
عدالت سے اس کو ڈگری ملی، لیکن ملزم رقم کی ادائیگی میں حیلہ حوالے سے
کام لیتا رہا۔ اس لئے اس کو گرفتار کر کے دوبارہ عدالت میں حاضر
کیا گیا۔ می لارڈ ان مہاجرین کا عجیب حال ہے۔ یہ کماتے ہیں۔ دولت
اکٹھی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو مفلس اور قلاش ظاہر کرتے ہیں اس طرح
لوگوں کو دھوکا دینا ان کا شیوہ ہو گیا ہے۔ ملزم بھی اسی قسم کے
لوگوں میں سے ہے۔ می لارڈ! مدعی کا دعویٰ اس کے خلاف ثابت
ہے۔ اس لئے قانوناً یا تو ملزم سے روپے وصول کئے جائیں یا عدم

ادائیگی کی صورت میں اس کو جیل کی ہوا کھانے کے لئے چھوڑ دیا جائے

جج :- "ملزم تم جو کچھ چاہو کہو"

دیوان غالب :- منظور ہے گزارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

سرکاری وکیل :- می لارڈ! ملزم نثر میں بات کیوں نہیں کرتا۔ اگر اس نے بار بار تنبیہ کرنے پر بھی نثر میں بات نہیں کی تو اس کے خلاف توہین عدالت کا دوسرا مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔

دیوان غالب کا وکیل :- می لارڈ! ایکسکیوز می [illegible] یوڈونٹ انسٹنڈ۔ اشعار میں عدالت کے سوالات کے جواب دینا کسی بھی قانون کی رو سے توہین عدالت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عدالت کے پاس کوئی ایسی دفعہ نہیں ہے جس کی رو سے وہ کسی خاص طرز میں بیان پر مجبور کر سکے۔

جج :- ملزم اپنا بیان جاری رکھے۔

دیوان غالب :- پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

جج :- تم قرض کی ادائیگی میں حیلے حوالے سے کیوں کام لے رہے ہو۔ سیدھے طریقے سے قرض ادا کیوں نہیں کرتے۔؟

دیوان غالب :- صرف بہائے مے ہوئے آلات میکشی
تھے یہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے!

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

جج :- تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم بالکل مفلس اور قلاش ہو۔ کیا تم اپنے دعوے کی تصدیق کے لئے گواہ پیش کر سکتے ہو؟

دیوان غالب :- صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

جج :- لیکن خدا کو گواہی کے لئے عدالت میں کس طرح لایا جا سکتا ہے اس لئے اگر تم دعوی کو ثابت نہ کر سکے تو تمہیں جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔

دیوان غالب :- حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

دیوان غالب کا وکیل :- انسان کی زندگی میں بعض لمحے ایسے آتے ہیں کہ اس کا نظام زندگی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ چند سال پہلے جو ہولناک حادثات ہوئے ان سے کون واقف نہیں۔ می لارڈ! ملزم کا گھر فسادات میں لٹ گیا۔ اس کا خاندان تباہ و برباد ہو گیا۔ ملزم کو ترک وطن کر کے یہاں آنا پڑا۔ ان حادثات کا ان کے دماغ پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ یہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے اور اپنا غم غلط کرنے کے لئے شعر و ادب کا مشغلہ شروع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص کیا دولت کما سکتا ہے۔ اور کیا پس انداز کر سکتا ہے۔ مدعی کی غفلت ہے کہ وہ ان حالات میں مدعا علیہ کو انجام سے بے خبر ہو کر شراب قرض دیتا رہا۔ می لارڈ! ملزم کے پاس کوئی رقم نہیں جس سے وہ قرض ادا کر سکے۔ اس کے بچے نان شبینہ کو محتاج ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کن کن دشواریوں میں اس کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ عدم ادائیگی کی صورت میں اس ملزم کو جیل کی سزا دینا مناسب ہے جس کا دماغی توازن صحیح ہو تاکہ اسے عبرت حاصل ہو اور آئندہ ایسی حرکت سے باز رہے۔ لیکن جس کا دماغی توازن ہی صحیح نہ ہو اس کو کیا عبرت ہو گی۔ اس لئے کہ جو کچھ اس نے کیا ہے قصد و ارادہ سے نہیں کیا ہے۔ لہذا می لارڈ ایسے ملزم کو سزا دینا شرط انصاف نہیں ہے۔ می لارڈ! اگر ملزم کے حالات پر ہمدردی سے غور کیا جائے تو ہر شخص یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گا کہ ملزم کو بری کر دیا جائے۔

جج :- (فیصلہ لکھتا ہے پھر سناتا ہے) تھانیدار کے بیان اور ملزم کے حالات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ملزم کا دماغ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے ملزم کو بری کیا جاتا ہے۔

(ایک سپاہی ملزم کو واپس لاتا ہے اور اسٹیج کے بیچ میں اسے چھوڑ کر ایک ہاتھ سے ذرا دھکا دیتا ہے)

دیوان غالب :-
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

●●

انتخابِ کلامِ غالب

(طنزیہ، شوخ و مزاحیہ)

لیتا ہوں کتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

کہتے ہو، نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشہ کر
مدار اب کھودنے پر گھانس کے ہے میرے درباں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشہ ہوا گلا نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

جب بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرّے پہ اک دل باندھا

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسد
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں پیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اس کی خطا نہیں یہ میرا قصور تھا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

علی الرغم دشمن شہیدِ وفا ہوں
مبارک مبارک سلامت سلامت

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
ہے کیا جو کس کے باندھئے میری بلا ڈرے
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تہی
دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں
جاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
نے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجئے
مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوۂ ہجراں
آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہے کہ تا
پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
اے کاش جانتا نہ تری رہگزر کو میں
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں
یاد تھی جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں
اس کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں
ہے کرا اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں
رکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پاؤں
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی
تعجب کھل جاوے کہ اس کو حسرت دیدار ہے
کندعا بھی کہاں دوں کو بدلنے نہیں دیتے
ہیں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

اگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اسکی روبکاری ہے

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کے تم مرے لئے ہوتے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

چاہئے اچھوں کو جتنا چاہئے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہئے

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہئے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہئے
ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہئے

وعدہ آنے کا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

ابن مریم ہوا کرے کوئی
مرے دکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پہ مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرہ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

اگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

نہ ہو زندہ ہم ہی کریں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کیلئے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

صالح اور صحت مند ادب کا ترجمان دوماہی

"شاخسار" کٹک

قیمت ۱ روپیہ، سالانہ ۵ روپیہ

پتہ :- بخشی بازار کٹک ۱ (اڑیسہ)

غالب کے لطیفے

●

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی آخری تاریخوں میں خط لکھا ہے۔ انہوں نے اس کا جواب جنوری ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا اس کے جواب میں ان کو اس طرح لکھتے ہیں" دیکھو صاحب یہ باتیں ہم کو پسند نہیں ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائیگا تو کہوگے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔"

ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا ہے، اس میں لکھتے ہیں، دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں، مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں، کبھی پانی پی لیا، کبھی کوئی روٹی کا ٹکڑا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں، میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔

●

مرزا صاحب کو ایک آفت ناگہانی کے سبب سے چند روز جیل خانے میں اس طرح رہنا پڑا جیسے حضرت یوسف کو زندان مصر میں۔ کپڑے میلے ہوگئے، جوئیں پڑ گئی تھیں۔ ایک دن بیٹھے ان میں سے جوئیں چن رہے تھے۔ ایک رئیس وہیں عیادت کو پہنچے۔ پوچھا کیا حال ہے؟ آپ نے یہ شعر پڑھا:

ہم غمزدہ جس دن سے گرفتار بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جس دن وہاں سے نکلنے لگے لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو وہاں کا کرتا پھاڑ کر پھینک دیا اور یہ شعر پڑھا:

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

مرزا صاحب کی پنشن سرکار سے ماہ بماہ ملتی تھی۔ بغاوت دہلی کے بعد حکم ہوا کہ ششماہی ملا کرے گی اس موقع پر ایک دوست کو لکھتے ہیں:

رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقید حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار

●

ایک دفعہ دلی میں مشاعرہ تھا۔ مرزا نے اپنی فارسی غزل پڑھی۔ مفتی صدرالدین صاحب اور مولوی امام بخش صاحب صہبائی اس مشاعرہ میں موجود تھے۔ مرزا صاحب نے جس وقت یہ مصرع پڑھا۔

"یہ وادیٔ کہ درآں خضر را عصا خفت است"

مولوی صہبائی کی تحریک سے مفتی صاحب نے فرمایا کہ "عصا خفت است" میں کلام ہے۔ مرزا نے کہا کہ حضرت! میں ہندی نژاد ہوں، میرا عصا پکڑ لیا، اس شیرازی کا عصا نہ پکڑا گیا: وہے بجلا اول عصائے شیخ بخفت۔ انہوں نے کہا کہ اصل محاورے میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ مناسب مقام ہے یا نہیں۔

ایک دفعہ مرزا صاحب بہت قرضدار ہوگئے۔ قرض خواہوں نے نالش کردی۔ جواب دہی میں طلب ہوئے۔ مفتی صاحب

کی عدالت تھی۔ جس وقت بیٹی میں گئے، یہ شعر پڑھا:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

●

ایک دن مرزا کے شاگرد رشید نے آ کر کہا "حضرت! آج میں امیر خسرو کی قبر پر گیا۔ مزار پر کھرنی کا درخت ہے۔ اس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں۔ کھرنیوں کا کھانا تھا کہ گویا فصاحت و بلاغت کا دروازہ کھل گیا۔ دیکھئے تو میں کیسا فصیح ہو گیا ہوں۔"

مرزا نے کہا۔ ارے میاں تین کوس کیوں گئے۔ میرے پچھواڑے کے پیپل کی پیپلیاں کیوں نہ کھالیں۔ چودہ طبق روشن ہو جاتے۔

●

بعض بعض شاگردوں نے مرزا سے کہا کہ آپ نے حضرت علیؓ کی مدح میں بہت قصیدے کہے اور بڑے بڑے زور کے قصیدے کہے۔ صحابہ میں سے کسی کی تعریف میں کچھ نہ کہا۔ مرزا نے تھوڑا تامل کر کے کہا ان میں کوئی ایسا دکھا دیجیے تو اس کی تعریف بھی کہہ دوں۔

●

غدر کے چند روز بعد پنڈت موتی لعل کہ ان دنوں میں مترجم گورنمنٹ پنجاب کے تھے۔ صاحب چیف کمشنر کے ساتھ دلی گئے اور حب الوطن اور محبت فن کے سبب سے مرزا صاحب سے بھی ملاقات کی۔ ان دنوں پنشن بند تھی۔ اور مرزا بسبب دل شکستگی کے شکوہ و شکایات سے لبریز ہو رہے تھے۔ اثنائے گفتگو میں کہنے لگے کہ عمر بھر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو مسلمان نہیں۔ پھر میں نہیں جانتا کہ مجھے سرکار نے باغی مسلمانوں میں کس طرح شامل سمجھا۔

●

مولوی فضل حق صاحب مرزا کے بڑے دوست تھے۔ ایک دن مرزا ان کی ملاقات کو گئے۔ ان کی عادت تھی کہ جب کوئی بے تکلف دوست آیا کرتا خالق باری کا یہ مصرعہ پڑھا کرتے تھے: بیا برادر آدرے بھائی۔ چنانچہ مرزا صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور یہی مصرعہ کہہ کر بٹھایا۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ مولوی صاحب کی رنڈی بھی دوسرے دالان میں سے اٹھ کر پاس آن بیٹھی۔ مرزا نے فرمایا۔ ہاں صاحب! اب وہ دوسرا مصرعہ بھی فرما دیجیے یعنی ع:
بنشیں مادر بیٹھ ری مائی

●

بہن بیمار تھیں۔ آپ عیادت کو گئے۔ پوچھا کیا حال ہے؟ وہ بولیں کہ مرتی ہوں۔ پر قرض کی فکر ہے کہ گردن پر لئے جاتی ہوں۔ آپ نے کہا کہ بوا بھلا یہ کیا فکر ہے خدا کے ہاں کیا مفتی صدرالدین بیٹھے ہیں جو ڈگری کر کے پکڑوا بلائیں گے؟

بھوپال سے ایک شخص دلی کی سیر کو آئے مرزا صاحب کے بھی مشتاق ملاقات تھے۔ چنانچہ ایک دن ملنے کو تشریف لائے (مرزا صاحب بھی بہت اخلاص سے ملے) مگر وضع سے معلوم ہوتا تھا کہ نہایت پرہیزگار اور پارسا شخص ہیں۔ یہ ان سے بکمال اخلاق پیش آئے مگر مرزا کا وہ معمولی وقت تھا، بیٹھے سرور کر رہے تھے۔ گلاس اور شراب کا شیشہ آگے رکھا تھا ان بے چارے کو خبر نہ تھی کہ آپ کو یہ شوق ہے انہوں نے کسی شربت کا شیشہ خیال کر کے ہاتھ میں اٹھا لیا۔ کوئی شخص پاس سے بول اٹھا کہ جناب یہ شراب ہے۔ بھوپالی صاحب نے جھٹ شیشہ ہاتھ سے رکھ دیا اور کہا کہ میں نے شربت کے دھوکے سے اٹھایا تھا۔ مرزا صاحب نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ زہے نصیب، دھوکے میں نجات ہو گئی۔

تبصرہ
از عاتق شاہ

سوویت جائزہ

جلد ۳
فروری ۱۹۶۹ء

غالب کی صد سالہ تقریبات دنیا کے ہر متمدن ملک میں بڑے زور و شور سے منائی جا رہی ہیں اس موقع پر ملک اور بیرون ملک کے اخبارات اور رسائل نے خصوصی نمبر شائع کر کے اس عظیم شاعر کی بارگاہ میں اپنا ہدیہ عقیدت پیش کیا ہے سوویت جائزہ میں لکھنے والے سوویٹ یونین کے وہ اسکالرس ہیں جنہوں نے غالب کو صرف سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ غالب کو پانے کے لئے اس طوفان کا بھی پتہ چلایا جس کی نذر تہذیبی اور انسانی زندگی کی ہر قدر ہو گئی تھی۔

زیر نظر شمارہ آٹھ مقالوں پر مشتمل ہے جو غالب کی نجی اور فن کارانہ زندگی کے مختلف راستوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور ان کے شعور سفر کی داستان سناتا ہے ان میں سے ہر مقالہ اپنے موضوع اور نقطۂ نگاہ کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہے۔ پہلا مقالہ ادارہ اقوام ایشیاء کے ڈائرکٹر بابا جان غفوروف کا ہے جس میں انہوں نے بتایا کہ سوویٹ یونین میں غالب کی مقبولیت کا راز دراصل غالب کی بے پناہ انسان دوستی میں مضمر ہے۔

"انیسویں صدی کا ہندوستانی ادب اور مرزا غالب" میں ای۔ خنیف نے بڑے کام کی باتیں پیش کیں۔ کلکتہ کے سفر سے غالب کے نقطہ نگاہ میں بڑی تبدیلیاں آئیں۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے شنیف نے اس تاریخی پس منظر کو پیش کیا۔ جب رام موہن رائے نے پہلی بار انتہا پسند جاگیردارانہ مذہبی تنگ نظری کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ اور نئے بنتے ہوئے سماج میں انسانی رشتوں کو جائز مقام دلانے کے لئے جد و جہد کی۔ اس کا اثر بنگالی ادب پر ہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں کے ادب پر بھی پڑا۔ غالب نے اس عقلیت کو قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس کے عملی حصہ دار بن گئے۔

"غالب کا فلسفہ حیات" کا تجزیہ کرتے ہوئے گوردن پولنکایا نے ممتاز فلسفی شاہ محمد اسمٰعیل کا ذکر کیا ہے جو اسلامی جاگیریت کے کٹر دشمن تھے۔ اور جنہوں نے اپنے فلسفے کی بنیاد وحدت وجود کے تصور پر رکھی۔ غالب نے اسے قبول ہی نہیں کیا بلکہ خود ان کی فطری مطابقت کو اس سے بڑی تقویت ملی

اے۔ سو خاچیف کا "حالی اور مرزا غالب" صرف تقابلی مطالعہ نہیں بلکہ اس پورے دور کو سامنے لاتا ہے جب ادب زندگی کی طرف کروٹ بدل رہا تھا۔

"غالب اور اقبال" کے عنوان سے لکھنے والے ین۔ پریگیرینا ہیں۔ جنہوں نے بڑی محنت اور گہری نظر سے ان سمبلس کو پیش کیا جو غالب کے یہاں ایک مفہوم رکھتے ہیں تو اقبال کے یہاں دوسرا۔

باقی دو مقالے غضنفر علی رووف کے ہیں۔ ان میں سے ایک "فارسی میں غالب کا رنگ تغزل" اور دوسرا "سوویٹ یونین میں غالب کی تخلیقات کا مطالعہ" ہر طرح سے قابل لحاظ ہے۔

صرف چونسٹھ صفحات پر پھیلا ہوا یہ علمی، ادبی اور تحقیقی رسالہ باوجود مختصر ہونے کے ان ضخیم رسالوں پر بھاری ہے جو ان دنوں شائع ہو رہے ہیں۔

اس کے ایڈیٹر حیدرآباد کے مشہور جرنلسٹ احمد معظم ہیں جو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ اس بار وہ یقیناً آپ کی ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں۔

امید ہے کہ سوویٹ جائزہ کا یہ شمارہ علمی اور ادبی حلقوں میں دلچسپی اور توجہ سے پڑھا جائے گا۔

رسالہ پر قیمت درج نہیں ہے۔

ملنے کا پتہ: شعبہ اطلاعات۔ سفارت خانہ سوویٹ یونین مقیم ہند۔ ۲۵- بارہ کھمبا روڈ۔ نئی دہلی۔

گلبہار کمپنی
حیدرآباد۔ معظم جاہی مارکٹ۔ فون
اسپیشل گلبہار اگربتی
عطر گلبہار
GULBAHAR CO
کلی
کھل کر خوشبو دیتی ہے
اسپیشل گلبہار اگربتی
جل کر خوشبو دیتی ہے